خصوصی شمارہ

اسلام اور عصرِ جدید

اکتوبر ۲۰۲۵ء
[جلد: ۵۷ — شمارہ: ۴]

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سفر صد سالہ
[تاریخ و تہذیب کے آئینے میں]



ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

اسلام اور عصرِ جدید

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سفر صد سالہ:

[تاریخ وتہذیب کے آئینے میں]

مدیر اعلیٰ

پروفیسر حبیب اللہ خاں

مدیر

ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی

نائب مدیر

ڈاکٹر محمد سعید انور

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

اسلام اور عصرِ جدید (سہ ماہی)

Peer Reviewed

ISSN 2278-2109

(جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر)

جلد: ۵۷	اکتوبر ۲۰۲۵ء	شمارہ: ۴

زرِ اشتراک

	فی شمارہ	سالانہ	
اندرونِ ملک	-/200 روپے	-/380 روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
پاکستان وبنگلہ دیش	4/امریکی ڈالر	15امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
دیگر ممالک	12/امریکی ڈالر	40امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے)

اس شمارے کی قیمت -/200روپے

حیاتیاتی رکنیت:

□ اندرونِ ملک 5000/روپے □ پاکستان وبنگلہ دیش 150امریکی ڈالر □ دیگر ممالک 400امریکی ڈالر

نوشاد عالم
تصحیح وتزئین

فیضی گرافکس
کور ڈزائن

راشد احمد
پرنٹننگ اسسٹنٹ

ملنے کا پتا: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۔ ۲۵

Website: https://jmi.ac.in/zhiis E-mail:zhis@jmi.ac.in

طابع وناشر: اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۔ ۲۵

مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲

نوٹ: مقالہ نگاروں کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

فہرست مراجعین

○ پروفیسر محمد اسحاق
سابق صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

○ پروفیسر عبدالماجد قاضی
شعبۂ عربک، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

○ پروفیسر فہیم اختر ندوی
شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

○ ڈاکٹر محمد ارشد
شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

○ ڈاکٹر عمر فاروق
شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

○ ڈاکٹر وارث مظہری
شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد (نئی دہلی)

○ جنید حارث
شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

فہرست

حرف آغاز

رواں سال کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کامل ایک صدی سے زیادہ کا سفر مکمل کر چکا ہے۔ یہ ادارہ اس وقت قائم ہوا تھا جب دنیا کے بیشتر حصے نوآبادیاتی جبر کے پنجے میں دبے ہوئے تھے اور آزادی کے متوالے آزادی کی ایک ایک سانس کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے تھے۔ جامعہ بھی دراصل اسی جبر سے آزادی کی ایک سانس کی طرح قائم ہوا تھا۔ استعماری طاقتیں جب جسم وجاں کے ساتھ ساتھ ذہن ونظر کو بھی اسیر اشارہ ابرو کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس وقت آزادی کے متوالوں نے ایک فیصلہ لیا کہ اپنے علم ودانش اور اپنی ذہنی وفکری قوتوں کو اپنے بل بوتے پر آزاد رکھیں گے اور آزادی فکر اور آزادی رائے کے حق کی حفاظت کریں گے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اسی مقصد کے حصول کے لیے قائم ہوئی تھی

جامعہ کا قیام، جیسا کہ معلوم ہے علی گڑھ میں ہوا تھا۔ روزاول سے

ہی استعماری طاقتیں اس کے خلاف صف آرا ہو گئیں، اِن طاقتوں نے آزادی کی ہر آواز اور ہر فکر کو زورِ بازو سے دبانے کی کوشش کی، اس کے لیے ہمدردی کا گوشہ رکھنے والے زدوکوب اور اخراج کی سزا کے مستحق ٹھہرے، تعلیمی اداروں کے دروازے ان پر بند کیے گئے۔ جامعہ کے لیے مشکلات کا یہ سفر ایک طرف تو استعماری طاقتوں کی وجہ سے مشکل تر ہو رہا تھا دوسری طرف اہل جامعہ نے بھی ہمیشہ راہ عزیمت اختیار کی اور کبھی بھی اپنے رویوں اور عمل میں مداہنت اختیار نہیں کی، اس لیے جب تک استعماری قوتیں برسرِ اقتدار رہیں ،ان کی مشکلات میں بھی اضافہ ہی ہوتا رہا۔

جامعہ کی کہانی اگر چہ سو سال کی کہانی ہے، لیکن اس میں غیر معمولی قربانیوں، انقلابی فکر، نیا کرنے کا حوصلہ اور نمونہ، آزادی اظہار رائے کے لیے قربانی کا جذبہ، تدریس کو عبادت سمجھ کر خدمت کرنے کا جذبہ، تعلیم کے لیے نئے تجربات اور تعلیم کے نئے میدانوں کی تلاش کے ایسے نادر نمونے ملتے ہیں کہ یہ سفر صدیوں پر محیط معلوم ہوتا ہے۔

تعلیم کے میدان میں جامعہ کا ایک انقلابی اقدام یہ تھا کہ تعلیم مادری زبان میں دی جائے گی، اس لیے اول دن سے ہی جامعہ میں اردو زبان ذریعہ تعلیم رہی۔ اسی طرح جامعہ ان ابتدائی اداروں میں سے ہے جہاں تعلیم وتدریس کے لیے اساتذہ کی تربیت کو ضروری قرار دیا گیا اور باضابطہ اساتذہ کی تربیت کے لیے 'استادوں کا مدرسہ' قائم کیا گیا، جو آج فیکلٹی آف ایجوکیشن بن چکا ہے۔ جامعہ میں فطری ماحول کے اندر تعلیم وتربیت پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ فنی تربیت کو تعلیم کا لازمی حصہ بنایا گیا، اسی کے ساتھ بچوں کی ابتدائی تعلیم، خاص طور پر درجہ اول سے پہلے کی تعلیم کے میدان میں انقلابی اقدامات کیے گئے۔

تعلیم کے میدان میں ۱۹۳۶ء میں گاندھی جی نے 'نئی تعلیم' کی بنا

ڈالی تھی، گاندھی جی کی اس تعلیمی پالیسی میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی سفارشات کا کلیدی کردار تھا، حسن اتفاق ہے کہ موجود دور میں نئی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ء کے اندر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے موجودہ شیخ الجامعہ کا کلیدی کردار ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ایثار و قربانی سے عبارت ہے، جامعہ کے اندر آسودگی اور وسائل حیات کی فراوانی کبھی بھی مقصد حیات نہیں رہی۔ جامعہ میں ہمیشہ ایثار و قربانی کو اہمیت دی گئی۔ اردو ہندی کے عظیم ادیب اور افسانہ نگار منشی پریم چند نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس عظیم کردار کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

......آندولن شروع ہونے کے بعد ریاستوں سے ملنے والی امداد تو بند ہوگئی اور اسے کیول (صرف) جنتا کی سہایتا اور اپنے کرمچاریوں کے سہیوگ (تعاون) اور تیاگ (قربانی) کا آشرے (سہارا) رہ گیا۔ اس پرستھتی (حالت) میں بھی ادھیاپک گن (اساتذہ برادری) نے کتنی ہی لگن اور اُتساہ سے کام کیا، کہ بہت تھوڑے سے گزارے پر رہ کر بھی برابر سیوا کار یہ (خدمت) میں لگے رہے۔ ان میں سبھی اتنے سویگیہ (باصلاحیت) ہیں کہ ان کے لیے کسی سنستھا میں استھان مل سکتا تھا، پر انھوں نے جامعہ ملیہ کا دامن نہ چھوڑا اور ہر طرح کا کشٹ اٹھاتے ہوئے پرسن مکھ (خوش دلی) اور آتمئے اتساہ (ذاتی جذبہ ولگن) سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ان سب کٹھنائیوں کے ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس اپنی کئی عمارتیں ہیں، پستکالیہ ہے اور پرکاشن وبھاگ ہے۔

(ماہنامہ، ہنس، نومبر ۱۹۳۲، کلیات پریم چند، جلد ۲۴، ص: ۲۲۱)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذمہ داروں کی یہ قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں۔ آج یہ جامعہ نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر اہمیت کا حامل ادارہ بن چکا ہے اور علم، فن، سائنس و ٹکنالوجی اور صنعت و حرفت کے

میدان میں اس جامعہ کے فیض یافتگان پوری دنیا میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کی تعمیر و تشکیل مکمل طور پر سیکولر روایات پر مبنی رہی ہے، یہاں ہندو مسلم سب نے مل کر اس ادارے کو تشکیل دیا ہے۔ اس جامعہ سے جہاں مولانا محمد علی جوہر کا نام وابستہ ہے تو مہاتما گاندھی بھی اس کے بانی ہیں، اس کو ترقی دینے میں مسلمانوں نے جس طرح غیر معمولی کردار ادا کیا اسی طرح غیر مسلموں نے بھی اس ادارے کو ترقی دینے میں اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ یہاں حکیم اجمل خاں کی قربانیاں ہیں تو جمنا لال بجاج کی گراں قدر خدمات بھی لائق تحسین ہیں۔

اسلام اور عصر جدید کے موجودہ شمارے میں جامعہ کے اسی صد سالہ سفر کے کچھ نقوش پا کو یاد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ اس طویل راہِ سفر کا کوئی قابل ذکر نقش نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ آئندہ کے سفر کی منصوبہ بندی اس نہج پر ہو کہ ہماری روایات ہمارے ساتھ ہوں اور مستقبل کے تقاضوں کی مکمل پاسداری ہو۔ کامیابی ذمہ داری لاتی ہے اور ذمہ داری مزید محنت کی طالب ہوتی ہے، ہماری کوشش ہے کہ ہم اپنے ماضی سے روشنی حاصل کریں اور جامعہ کو انھی خطوط پر بہت آگے لے جانے کی کوشش کریں جو ہمارے اکابر نے اس کے لیے متعین کیے تھے۔ اسی احساس کے تحت یہ شمارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام معنون ہے۔

محمد مشتاق تجاروی

عبداللہ ولی بخش قادری *

جامعہ کی تعلیمی فکر

اس حقیقت کو اکثر دہرایا جاتا ہے کہ جامعہ کا وجود ہماری جدوجہد آزادی کی ایک تڑپ کا نتیجہ ہے اور وہ تعلیمی میدان میں تحریک عدمِ تعاون کے ایک مظہر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بات بالکل بجا ہے لیکن پوری نہیں ادھوری ہے۔ اس کی معنویت دراصل اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اپنے وقت کے سب سے زیادہ نمایاں اور نمائندہ مسلم ادارے سے اٹھی اور رہبرانِ قوم نے ان کی آواز پر لبیک کہنے والے نوجوانوں اور استادوں کو اطمینان دلایا کہ تمہارے لیے ایک علاحدہ ادارے کا اہتمام کیا جائے گا۔ اس ضمانت کے پس پردہ مذہبی، تہذیبی اور لسانی نمائندگی اور پاسداری کا ادراک واحساس صاف طور پر کارفرما نظر آتا ہے جس کی تعبیر وتشکیل میں جامعہ کے بانی اور معمار یک زبان ہوکر لگے رہے ہیں اور حصولِ آزادی کے بعد گاندھی جی کے اس ردِّعمل میں بھی صدائے بازگشت کے مصداق سنائی دیتی ہے جو جامعہ کا نام بدلنے کے سلسلے میں انھوں نے کہا تھا۔ جامعہ کے تشخص کی شناخت اور اس کے منفرد وجود کا اظہار اسی طور پر ہوتا ہے۔ وہ محض ایک تعلیمی ادارہ بن کر وجود میں نہیں آئی بلکہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت کی شانِ امتیاز کی اہل اور علامت بھی بنی اور اس کے مقدر میں اس کی نمائندگی بھی آئی۔

* سابق لکچرر، ٹیچرس کالج، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

جامعہ کے نصب العین اور فرائض کا واضح اعلان ہمیں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے خطبۂ صدارت جلسۂ بموقع افتتاح مؤرخہ ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ہی مل جاتا ہے۔ ان کا ارشاد ہے:

"اے فرزندانِ توحید! میں چاہتا ہوں کہ آپ انبیاء ومرسلین اور ان کے وارثوں کے راستے پر چلیں۔"

اسی خطبہ میں کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں:

"ہاں ضرورت اس کی ہے کہ وہ تعلیم مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو اور اغیار کے اثر سے کلیتاً آزاد ہو۔ کیا باعتبار عقائد وخیالات کے اور کیا باعتبار اخلاق واعمال اور کیا باعتبار اوضاع واطوار کے، ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔"

اسی خطبے کی روح ہمیں پہلے امیرِ جامعہ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کے پہلے جلسۂ تقسیم اسناد ۱۹۲۱ء کے خطبۂ صدارت میں جاری وساری نظر آتی ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا:

"...... ہم نے اپنا ملّی فرض سمجھا کہ اس جامعہ کی بنیاد رکھ دیں اور اپنے جدید تعلیم کے مقاصد وہی رکھیں جن کی طرف ہم اشارہ کرچکے ہیں یعنی ایسے مسلمان پیدا کرنا جو اپنے مذہب سے واقف ہی نہیں بلکہ اس پر سختی سے عامل بھی ہوں، جو اپنے ماضی سے بخوبی آشنا اور اپنے مستقبل سے آگاہ ہوں، جو دنیا میں اپنے اور اپنی قوم کے وجود کی اصلی غایت جانتے ہوں اور اپنے مذہب کے مبلغین کی صف میں ایک مفید فرد کی حیثیت سے شامل ہوسکیں۔ وہ جدید علوم سے ضرور واقف ہوں لیکن نمونہ ہوں اسلامی طرزِ زندگی کا، وہ اپنی روزی کمانے میں کسی کے دست نگر نہ ہوں اور ایک

خود دار مسلمان کی طرح زندگی بسر کرسکیں۔"

اسی خطبے میں مسیح الملک نے پانچ بنیادی اصول بیان کیے ہیں:

(۱) از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

"اگرچہ ہم نے تمام دیگر علوم جدیدہ کو اپنے نظام میں جگہ دی لیکن قرآن اور اسلام کو مخدوم بنایا اور انھیں خادم۔"

(۲) تاریخ اسلامی

"ہم نے تاریخ اسلامی کو اپنی تعلیم کا جزوِ لازمی قرار دیا کہ یہ نفس ملیہ کے تواتر کو قائم رکھنے کے لیے بمنزلۂ حافظہ ہے۔"

(۳) مادری زبان میں تعلیم

"ہم طالب علم میں علم کا ذوق پیدا کرنا اور اس کے اعمال پر اس کا اثر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ہم نے ایک غیر زبان میں ذریعے تعلیم دینے کے غیر فطری طریقہ کا بھی بہ یک قلم سدّباب کردیا۔

(۴) کسبِ معاش اور تعلیمِ حرفہ

"میں یقیناً یہ چاہتا ہوں کہ ہم اپنے متعلقین کے لیے کسبِ معاش کی ہر ممکن سہولت فراہم کریں اور مجھے بڑی خوشی ہے کہ جامعہ ملیہ کے جدید نظام میں تعلیم صنعت وحرفت ہر شخص کے لیے لازمی قرار دی گئی ہے۔"

(۵) متحدہ ہندستانی قومیت

"جہاں ہم نے سچے مسلمان پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کیں وہاں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ تعلیم

وتربیت میں ماحول کا ایک بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور اسلامیت کے ساتھ وطن کی خدمات کا جذبہ پیدا کرنا بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ چنانچہ اس امر کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا ہے کہ جہاں ہندو طلبہ کے لیے بہت سے اسلامی معاملات و معلومات حاصل کرنا ضروری ہے وہاں مسلمان طلبہ بھی اہم ہندو رسوم اور ہندو تہذیب وتمدن سے نا آشنا نہ رہیں گے کہ ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کی اساسِ محکم اسی باہمی تفہیم وتفہم پر منحصر ہے۔

مسیح الملک کے بعد بھی جامعہ کے دیگر بانی اور معماران مقصودات ونشاناتِ راہ کا اپنے اپنے الفاظ میں موقع بہ موقع اعادہ کرتے رہے ہیں۔ سید الاحرار مولانا محمد علی جوہر، جنھوں نے علی گڑھ کالج کے طلبہ سے گاندھی جی کو متعارف کرایا تھا اور گاندھی جی کے ہمراہ علی گڑھ میں طلبہ سے گفتگو میں شریک تھے اور وہی جامعہ کے قیام پر اس کے سربراہ قرار پائے تھے اور بلاشبہ اس وقت مسلمانوں کے سب سے ممتاز رہنما بھی تھے، برابر جامعہ سے تعلقِ خاطر برتتے رہے۔ انھوں نے جامعہ کے مقاصد کو خدا پرستی، ملت پروری، وطن دوستی سے تعبیر کیا ہے۔ (ہمدرد، دہلی ۱۸ر جنوری ۱۹۲۸ء) اور دہلی میں جامعہ کو حیاتِ نو دینے والے، اس سے قبل علی گڑھ کالج کے ممتاز طالب علم اور طلبہ کے لیڈر کی حیثیت سے سب سے پہلے جامعہ کے لیے علی گڑھ کالج چھوڑنے والے اور جامعہ میں شامل ہونے والے، ہم سب کے ذاکر صاحب نے جامعہ کے جشن سیمیں کے موقع پر ۱۹۲۶ء میں اپنے کتابچہ جامعہ ملیہ کیا ہے؟ میں تحریر فرمایا:

"جامعہ ملیہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہبِ اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی

محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی... جامعه کا دوسرا مقصد یه هے که هندوستانی مسلمانوں کی آئنده زندگی کے اس نقشے کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم کا ایك مکمل نصاب بنائے اور اس کے مطابق ان کے بچوں کو جو مستقبل کے مالك هیں تعلیم دے۔ جامعه علم محض روزی کی خاطر جو همارے ملك کی جدید تعلیم کا اصول هے اور علم محض کی خاطر جو قدیم تعلیم کا اصول تھا، دونوں کو بهت تنگ اور محدود سمجھتی هے۔ وہ علم زندگی کی خاطر سکھانا چاهتی هے جس کے وسیع دائرے میں مذهب، حکمت اور صنعت، سیاست اور معیشت سبھی کچھ آجاتا هے۔ وہ اپنے طلبه کو اس قابل بنانا چاهتی هے که قومی تهذیب اور عام انسانی تهذیب کی هر شاخ کی قدر وقیمت کو سمجھ سکیں اور اپنی قابلیت کے مطابق اس کی کسی ایك شاخ میں اس طرح سے کام کریں که ان کا کام کسی نه کسی حد تك مجموعی زندگی کے لیے مفید هو۔"

ذاکر صاحب ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ سے قرول باغ، نئی دہلی منتقل ہوئے، پانچ سالہ پودے کو جرمنی سے آکر سینچا اور پروان چڑھایا۔ وہ اس کی دو ڈھائی سال نشو ونما میں شریک رہنے کے بعد جرمنی گئے تھے۔ وہاں انھیں دو ہندوستانی دوست بنانے کو مل گئے۔ وہ بھی ان کے ساتھ جرمنی سے آئے اور اپنے دوست کے کارِ شوق میں دل سے شریک ہوکر جامعہ کے لیے وقف ہوگئے۔ یہ تھے ہمارے ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب۔ دونوں نے ذاکر صاحب کا برابر کا ساتھ دیا اور جامعہ کی بڑی بڑی ذمے داریاں نبھائیں۔ جامعہ کے جشن سیمیں کے ساتھ ساتھ ہندستان فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس وقت جامعہ اپنے اولین پڑاؤ قرول باغ میں بھی تھی اور اپنے نئے مستقر جامعہ نگر میں بھی آباد ہو رہی تھی۔ قرول باغ کی جامعہ تو بالکل جل گئی، برباد ہوگئی اور جامعہ نگر کی جامعہ لٹ سی گئی۔ آزادی آئی

مگر اپنے جلو میں قتل وغارت گری کے علاوہ نقلِ مکانی کی صعوبتیں بھی لے کر آئی اور اس انتشار کا شکار جامعہ بھی ہوئی لیکن اس سے بڑھ کر ایک دھکا جامعہ کو یہ لگا کہ ملکی مصالح نے ذاکر صاحب کو جامعہ سے چھین لیا اور اس فساد زدہ، آزردہ خاطر جامعہ کی مسیحائی کی ذمے داری مجیب صاحب پر آئی۔ انھوں نے ۱۹۷۳ء تک اس کی آبیاری کی۔ جشنِ چہل سالہ منایا، جشن زریں منایا، جاہ وحشمت سے بے نیاز رہ کر جامعہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا، نہ صلہ کی پروا، نہ ستایش کی تمنا۔ جامعہ کی مسلسل ۴۵ سال سے زائد خدمت کی لیکن اعتراف تو کجا کبھی گردان کر یہ نہ دیا کہ کوئی خدمت بھی کی ہے۔ انھوں نے جن حالات میں جامعہ کی قیادت سنبھالی تھی وہ عدمِ استحکام کا دور تھا۔ انھوں نے اپنی دور بینی، استقلال وایثار سے اسے پروان چڑھایا۔ ان کے سامنے صرف اس کی بحالی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ یہ بھی دیکھنا تھا کہ اس کی شخصیت مسخ ہو کر نہ رہ جائے۔ سب سے بڑھ کر فکر یہ دامن گیر تھی کہ کسی طور نہ اس کی میراث لٹے اور نہ زبان بگڑے۔ اس احساس وادراک نے پھونک پھونک کر قدم رکھنے پر مجبور کیا اور تیز رفتار توسیع وترقی کی گنجایش نہ نکالی جا سکتی تھی۔ لہٰذا دورِ مجیب کا محتاط رویہ بالکل درست تھا۔ وہ تعطل نہیں تحفظ کا معاملہ تھا، اگر اس وقت یہ روش نہ اختیار کی گئی ہوتی تو اتنا بھی نہ ہو پاتا کہ آج کی طرح کچھ ہم نفسوں کو نگاہِ واپسیں کا یارا ہوتا۔ جامعہ کے منصب کے بارے میں مجیب صاحب نے ہمیں یوں یاددہانی کرائی ہے:

> جامعہ والے ایک چھوٹی سی جماعت ہیں مگر اس جماعت کی ساری محنت اور سارا کام بے کار جائے گا اگر وہ اپنی ملت میں فنا ہو کر اپنے نصب العین کو ہندوستان کے مسلمانوں کا نصب العین نہ بنا سکیں۔"
>
> (تقریر بموقع بنائے عمارت، استادوں کا مدرسہ ۱۹۳۸ء)

اکابرین جامعہ کے مختلف جملوں کو آپ سب کے سامنے دہرانے سے یہ صراحت پیش نظر رہی کہ شیخ الہند سے لے کر مجیب صاحب تک سب کی غرض وغایت ایک ہی رہی ہے کہ جامعہ کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی تعلیم ہے جو کہ مادری زبان کے ذریعے بہم پہنچائی جائے۔ جامعہ کے اساسی مقصد ومنہاج کے تحت ہی دورِ ذاکر میں قدم بڑھے اور بہت سے میدان سر ہوتے چلے گئے۔ دورِ مجیب میں انھیں نقوش کو مشعلِ راہ بنائے رکھا گیا اگرچہ فضا برابر ناسازگار ہوتی چلی جا رہی تھی۔ یہ ایک امر مسلمہ ہے

کہ کوئی زبان، علمی زبان بنے بغیر نہ ترقی کرسکتی ہے اور نہ اس کی بقا کی ضمانت کی جاسکتی ہے۔ جامعہ نے اردو کو اپنا ذریعہ تعلیم گردانا اور اس عزم کی بدولت زبان وادب کی ترویج واشاعت میں اس نے نہایت اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس کے اساتذہ کی تعداد کی نسبت سے اردو میں تصنیف وتالیف اور ترجمے کا کام جس تن دہی کے ساتھ یہاں ہوتا رہا ہے، اس کی مثال شاید ہی کہیں اور ملے۔ یہاں اردو کا دامن وسیع بھی ہوا ہے اور وقیع بھی۔ اس ترقی کی کم از کم مندرجہ ذیل جہتیں بآسانی دیکھی جاسکتی ہیں۔ بچوں کا ادب، درسی کتب، بالغوں کا ادب، علمی کتب، ادبی کتب، اسلامی ادب، تراجم، رسائل اور ان سب پر مستزاد جامعہ کا اردو ماحول۔ ان میں ہر ایک کے بارے میں ایک ایک طویل مضمون درکار ہے۔ تب ہی اس کا نقشہ سامنے آسکتا ہے۔ اس وقت نہ یہ ممکن ہے اور نہ کوئی ضرورت ہے۔

جامعہ میں ۱۹۳۰ء کے آس پاس بچوں کے ادب کی طرف شعوری طور پر توجہ دی گئی۔ ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب نے خود مثال قائم بھی کی اور رہنمائی وہمت افزائی بھی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ درسی کتب کا سلسلہ شروع ہوا۔ اعلیٰ معیار کی کتب تیار کی گئیں۔ چھوٹی جماعتوں کے لیے موضوع اور معیار کے مطابق مضامین تیار کرنا ہوتے ہیں۔ یہ سارا کام جامعہ کے اساتذہ نے ہی انجام دیا۔ بالغوں کے ادب کا تقریباً سو کتابوں کا سیٹ تیار ہوا جو آج بھی ایک نمونہ پیش کرتا ہے۔ ادارہ تعلیم وترقی کے کارکنان اور جامعہ کے اساتذہ نے بالغوں کے ادب میں نمایاں حصہ لیا اور اس ادارے کے رسالے نے اپنے مخصوص میدان میں گراں قدر خدمت انجام دی۔ عابد صاحب کے قلم سے کانٹ جیسے فلسفی کی Critique of pure Ream جیسی دقیق کتاب کا ترجمہ تنقید عقل محض کے نام سے ایک علمی کارنامے سے کم نہیں ہے۔ اس سے بالکل مختلف رنگ میں مہاتما گاندھی کی آپ بیتی My Experiemnts with truth کا ترجمہ 'تلاشِ حق' اپنی مثال آپ ہے۔ ذاکر صاحب کا افلاطون Republic کا ترجمہ ریاست بھی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ سعید انصاری صاحب نے جان اسٹورٹ مل کی کتاب Liberty کا ترجمہ 'آزادی' کے نام سے کیا ہے۔ وہ بھی اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ تصانیف کی فہرست میں علمی کتب کے تحت مجیب صاحب کی کئی تاریخ کی کتابیں جیسے 'تاریخ تمدن'، 'تاریخ فلسفہ'، 'سیاسیات' اور 'دنیا کی کہانی' آتی ہیں اسی طور پر عابد صاحب کی کتاب 'ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں' خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ ان سب کے ادبی کارنامے ان کتب کے علاوہ ہیں جیسے اردو ڈراما کے باب میں مجیب صاحب اردو ادب کا حصہ بن چکے ہیں۔ یہی

حال ترجمہ اور علمی نثر کے حوالے سے عابد صاحب کے نام گرامی کا ہے۔ بچوں کی نظموں کے سلسلے میں مولوی شفیع الدین نیر ایک مقبول ومعروف ہستی قرار پا چکے ہیں۔

حسین حسان صاحب اور عبدالغفار مدھولی صاحب نے بچوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ مدھولی صاحب اپنی سوانح 'معلم کی زندگی' کے لیے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اسلامی ادب کے باب میں مولانا اسلم جیراج پوری کی متعدد کتب غیر معمولی اہمیت اور مقبولیت کی حامل ہیں۔ بیگم صالحہ حسین بھی اردو ادب کا حصہ قرار پا چکی ہیں۔ یہ سب ہمارے بزرگانِ رفتہ ہیں اور مثال کے طور پر ان کے نام لیے گئے ہیں۔ ٹیچرس کالج کے اساتذہ نے اساتذہ کی تعلیم وتربیت کے بارے میں وافر ادبی کام کیا ہے۔ یہی حال شعبۂ اردو کا ہے اگر چہ وہ کوئی پرانا شعبہ نہیں ہے۔ ہمارے شعبہ تاریخ کے نوجوان بھی برابر اردو میں لکھ رہے ہیں۔ شعر وسخن کی نمائندگی بھی ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے احبابِ گرامی میں بہت سے اہم اور معروف نام نہیں لیے گئے ہیں کیوں کہ یہ فہرست بہت طویل ہے اور اختصار میں انصاف کا دامن چھوٹ جانے کا خطرہ لاحق ہے۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ تصنیف وتالیف کے میدان میں اساتذۂ جامعہ سرگرم وسربلند ہیں۔

میرے نزدیک جامعہ کی تعلیمی فکر کے سب سے مقدم اجزائے ترکیبی یہ دو ہی ہیں۔ کس کی تعلیم اور کیسے تعلیم۔ یعنی مسلمانوں کی تعلیم اور اردو کے ذریعہ تعلیم۔ اس ذمے داری سے انحراف کو میں جامعہ کی غرض وغایت سے روگردانی تصور کرتا ہوں، لیکن جامعہ کو قومی ادارہ مانتا ہوں، اقلیتی ادارہ نہیں۔ اس میں بلا تفریق مذہب وملت سب کی گنجایش رہی ہے اور بدستور رہنی چاہیے اور ایک قومی ادارے کی حیثیت سے ہی جامعہ کی ذمے داری سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے اساسی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کمر بستہ ہو جائے۔

اب رہا اردو ذریعۂ تعلیم کی افادیت اور اہلیت کا مسئلہ، اس وقت بحث کی گنجائش نہیں ہے مگر میں بلا بحث ہی پسپا ہوا جاتا ہوں۔ بس اتنا معلوم ہو جائے کہ کیا ہو سکتا ہے اور اس کا اپنے آپ کو پابند بنا لیا جائے۔ دراصل میرا منشا خود فریبی اور دھوکا دہی دونوں سے باز رہنا ہے۔

[بشکریہ: ''اردو زبان وادب کے فروغ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصہ'' — مرتبہ: صغریٰ مہدی]

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہانپوری *

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا ایک ترجمان
پروفیسر محمد سرور جامعی

۱۹۶۲ء کا کوئی ابتدائی مہینہ تھا جب پروفیسر محمد سرور صاحب سے ملاقات ہوئی۔ غائبانہ تعارف، مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم پر ان کے کام کی وجہ سے چند سال پیش تر سے تھا۔ مولانا سندھی مرحوم کے محقق، شارح اور مصنف کی حیثیت میں مجھے ان سے عقیدت پیدا ہو چکی تھی، سرور صاحب سے جس زمانے میں ملاقات ہوئی وہ میری ادبی زندگی کی بالکل ابتدا تھی، انھوں نے اس وقت ایک طالب علم اور اپنی کتابوں کا قاری سمجھ کر جو شفقت فرمائی تھی، ان بارہ تیرہ برسوں میں اس میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس دوران میں ان کی محبت اور شفقت میں اضافہ ہی ہوا ہے، اسی طرح میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری عقیدت میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا، پہلے ان سے عقیدت کی وجہ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم تھے، بعد میں خود ان کے علم و فضل، مطالعہ و نظر، ان کی سلامت روی، شرافت، وضع داری اور فکر و سیرت کے بے شمار محاسن نے متاثر کیا اور ان کی یہ خوبیاں میری عقیدت میں اضافے کا باعث ہوئیں۔ اس طرح سرور صاحب کی شخصیت، ان کی علمی خدمات اور ان کے افکار میرے مطالعے کا موضوع بن گئے۔ میں نے کھلے دل سے ان کی کتابوں سے استفادہ کیا، لیکن اس حیثیت سے کہ یہ ایک عالم، ایک

---
* مشہور محقق و مؤرخ اور مصنف

مصنف، ایک ادیب کا مطالعہ اور کاوش نظر ہیں، ان میں علم وفکر کے انمول موتی ہیں، ان میں سے کسی چیز کو حرف آخر کی حیثیت نہیں دی، میں نے ان سے محبت کی لیکن انھیں قرنِ اولیٰ کا مسلمان نہیں سمجھا، میرے نزدیک وہ ایک مسلمان کی مثالی زندگی کے حامل نہیں۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ہمارے علماء کی وضع قطع اور طرزِ زندگی ایک مسلمان کی مثالی زندگی ہے تو وہ اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ لیکن وہ ایک مہذب انسان ہیں اور معاشرتی زندگی کی ذمے داریوں کو خوب سمجھتے ہیں اور انھیں نبھاتے ہیں، اچھے برے اور جائز وناجائز کی تمیز رکھتے ہیں۔ مجھے ان کے ایمان وعقائد کے بارے میں بھی کبھی شبہ پیدا نہیں ہوا، ان کی زندگی میں عمل کی کوتاہیوں کی نشان دہی کی جاسکتی ہے لیکن انکار والحاد کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی، ممکن ہے وہ کسی رسم یا روایت کو اسلامی زندگی اور اسلامی معتقدات میں شامل نہ سمجھتے ہوں لیکن وہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایمان اور عمل صالح کی اہمیت کے اندازہ شناس ہیں۔ پچھلے بارہ تیرہ برس میں اگر میں نے ان کی تمام تحریریں نہیں پڑھیں تو بیشتر تحریروں کے مطالعے کا دعویٰ ضرور کرسکتا ہوں، پھر ان سے سفر وحضر میں ملاقاتیں ہوئیں اور میں نے کھلی آنکھوں سے ان کی زندگی کا مطالعہ بھی کیا ہے، اس کے علاوہ میری ان صاحبوں سے واقفیت بھی ہے اور بعض سے راہ ورسم بھی رہی ہے جو سرور صاحب کی بے دینی پر پختہ یقین رکھتے ہیں، اگرچہ سرور صاحب ان تمام باتوں سے بے نیاز ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ان کا کوئی عزیز یا نیاز مند جدید مفکرین اسلام اور صلحاء کی ان باتوں کا برا مانے، آخر ان حضرات نے سرور صاحب کے مرشد اور استاذ مولانا سندھی علیہ الرحمہ کے ایمان ہی کو کب تسلیم کیا ہے؟ ان پر بے دینی، کفر اور الحاد وفسق کا کون سا الزام ہوسکتا تھا جو ان پر نہیں لگایا، ستمبر ۱۹۴۴ء میں معارف (اعظم گڑھ) میں ایک نہایت اشتعال انگیز مضمون ان حضرات کی رائے وفکر کا مظہر ہے، اس طبقہ کے صلحا کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد طاغوت کے معاون تھے، ان کی جگہ اسلام کے دائرے سے باہر قرار پائی، مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم ''اگلے وقتوں کے یہ ہیں لوگ انھیں کچھ نہ کہو'' کی نشانی۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا احمد علی لاہوری ان کے نزدیک گردن زدنی وکشتنی، عام علماء ان کے خیال میں اسلام کی روح سے ناآشنا، اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کافۃً سے دور اور سیاست کی ابجد سے بے خبر، حتی کہ میونسپلٹی کے قواعد ومسائل تک سے لاعلم، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف، مولانا سلطان احمد وغیرہم اختلاف کے باعث حسو، شرفو وغیرہ کے قابلِ نفرت ناموں اور کرداروں کے مستحق

قرار دیے گئے، وہ اسلام کے مزاج اور دعوت اسلامی کے تقاضوں سے نہ صرف بے شعور بلکہ ان سے روگردانی اور اپنی چھوٹی چھوٹی شخصیتوں کے پیچ وخم میں مبتلا نظر آئیں جن کے قلموں کی تیزی اور جوش مخالفت کے آگے حضرت عثمانؓ سے لے کر موجودہ زمانے کے اکابر تک کسی کا ایمان، عزت اور دیانت محفوظ نہ رہی ہو اگر انھوں نے سرور صاحب کے ایمان کی تصدیق نہ کی تو اس میں تعجب اور حیرت کی کیا بات ہوسکتی ہے۔ اس مکتبۂ فکر سے سرور صاحب کو ایمان کا صداقت نامہ اور اسلام سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ کیوں کر مل سکتا ہے؟

اپنے اس مطالعے اور مشاہدے کے بعد میری رائے ہے کہ سرور صاحب ایک سیدھے سادھے مسلمان اور ایک شریف انسان ہیں اور اتنے کہ وقت اس کا متحمل نہیں ہوسکتا، ان کی شرافت نے بعض لوگوں کو ان پر قلم فرسائی کی جرأت دلائی ہے، ان کی شرافت نفسی اور تعلقات میں وضع داری سے بعض نام نہاد اہلِ قلم نے ہمیشہ ان کے علم کا استحصال کیا اور ان کے کمال تصنیف وتالیف سے خود فائدہ اٹھایا اور سرور صاحب کے مفاد و دفاع میں وہ اپنے قلم کو جنبش بھی نہ دے سکے۔

خاندان و تعلیم

سرور صاحب پنجاب میں گجرات کے ایک دور افتادہ گاؤں میں پیدا ہوئے، یہ بیسویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی کا تقریباً وسط تھا، وہ کسی امیر خاندان کے فرد نہیں ہیں، لیکن ان کا خاندان اپنی باعزت زندگی کے لیے خدا کے فضل کے سوا کسی کا محتاج بھی نہ تھا، پانچویں جماعت تک گاؤں کے اسکول میں تعلیم حاصل کی، پھر گجرات کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہوگئے، یہ اسکول مولانا سید عطاء اللہ بخاری نے تحریکِ ترکِ موالات کے دوسرے مقامی رہنماؤں کے تعاون سے قائم کیا تھا۔

اساتذہ

مذکورہ بالا اسکول کے استادوں میں مولانا نصر اللہ خاں عزیز بھی تھے، جنھوں نے بعد میں مدینہ بجنور کے ایڈیٹر اور ایک کانگریسی اور قوم پرور صحافی کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی۔ ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی میں شرکت کے بعد وہ جماعت اسلامی کے ترجمان صحافی کی حیثیت سے مشہور

ہوئے اور حلقۂ خاص میں انھیں بابائے صحافت کے نام سے پکارا گیا۔ سرور صاحب کے استادوں میں دوسری نامور ہستی ملک حسن علی کی تھی، ملک صاحب علمی حلقوں میں مجدد الف ثانی پر اپنے کام اور مشاھد التوحید کی عظیم الشان تصنیف کی وجہ سے معروف ومشہور ہستی ہیں، سرور صاحب کے اپنے استادوں میں گجرات کے ایک اور بزرگ مولوی فیض میران صاحب کا ذکر بھی ہے، ان کے علم وفضل کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ بعض استادان سے حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی عظیم الشان تصنیف حجۃ اللہ البالغہ پڑھا کرتے تھے، سرور صاحب ان سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔

سرور صاحب کے افکار کی تاریخ مولوی فیض میران، ملک حسن علی اور مولانا نصر اللہ خاں عزیز کی شاگردی سے شروع ہوتی ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ

۱۹۲۳ء میں آزاد مسلم ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد وہ علی گڑھ جا کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخل ہوگئے، جامعہ ملیہ اس وقت تک دہلی منتقل نہیں ہوئی تھی۔ جامعہ ملیہ ۱۹۲۰ء میں ترکِ موالات کی تحریک کے نتیجے میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا سنگِ بنیاد علی گڑھ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے مقدس ہاتھوں سے رکھا گیا، جامعہ ملیہ مسلمانوں کے جذبۂ آزادی کی ایک علامت، حریت پروری کی مثال اور اخلاص وایثار کا سرچشمہ تھی۔ وہ برِاعظم پاک وہند میں مسلمانوں کی علمی وفکری اور تہذیبی وثقافتی سرگرمیوں کا آج بھی بڑا اور اہم مرکز ہے۔ برصغیر کی علمی اور تہذیبی وثقافتی زندگی پر اس کے رہنماؤں اور اس کے فرزندوں نے نہایت روشن نقوش ثبت کیے ہیں، اور یہ ذوقِ خدماتِ ملی، قومی اور علمی آج بھی اس کے اساتذہ اور خدام میں پایا جاتا ہے۔

۱۹۲۵ء میں جامعہ علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوئی، سرور صاحب جس زمانے میں دہلی پہنچے تو اگرچہ ترکِ موالات اور تحریک خلافت کی آگ ٹھنڈی ہوچکی تھی لیکن راکھ میں دبی ہوئی کچھ چنگاریاں ابھی باقی تھیں۔ برٹش حکومت کے خلاف نفرت اور حریت طلبی کا چولہا جن احرارِ اسلام اور زعمائے ہند نے روشن کیا تھا وہ سب زندہ تھے اور جامعہ ملیہ سے ان سب کا قریبی تعلق تھا۔ حکیم محمد

اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے مسلمان اور ہندو اکابر جامعہ میں آتے رہتے تھے، جامعہ کے ایک ہونہار اور ذہین طالب علم کی حیثیت سے سرور صاحب کو ان حضرات کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

جامعہ کے استاد

اس زمانے میں ان کے اساتذہ میں مولانا خواجہ عبدالحی فاروقی اور ڈاکٹر محمد علی شاہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خواجہ صاحب مرحوم مولانا ابوالکلام سے نسبتِ ارادت، ان کی تحریک حزب اللہ سے وابستگی، مولانا سندھی مرحوم سے استفادے، برسہا برس تک جامعہ ملیہ میں شعبۂ اسلامیات کی صدارت اور قیام پاکستان کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں درس وتدریس کے مشغلے اور قرآن حکیم کی تعلیم وتفسیر کے ذوق وشغف کی بنا پر علمی اور دینی تعلیمی حلقوں کی معروف شخصیت ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی شاہ مرحوم جس پائے کے عالم تھے اس کے مطابق انھیں اردو کی علمی دنیا میں شہرت نہیں ملی۔ ڈاکٹر صاحب سندھ سے تعلق رکھتے تھے اور مولانا سندھی مرحوم کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے اور انھی کے فیضان تعلیم وصحبت نے انھیں حضرت شاہ ولی اللہ کا گرویدہ اور محقق بنا دیا تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ سے انھیں خاص شغف تھا اور وہ جامعہ ملیہ میں اس کا درس دیا کرتے تھے۔

جامعہ کے استادوں میں ایک نامور ہستی مولانا محمد سورتی کی تھی جو اپنے وقت میں عربی زبان کے بڑے ماہر اور عربی ادب کے بلند پایہ وبے نظیر عالم ومحقق، علم کے سچے عاشق اور قدیم اسلامی تصنیفات کی علمی حیثیت کے اندازہ شناس تھے، مسلکا اہلِ حدیث اور نہایت متقی و پرہیزگار شخص تھے، وہ اگرچہ ایک قدامت پسند عالم سمجھے جاتے تھے، لیکن عربی زبان وادب میں ان کا پایہ عربی کے کسی امام ونقادوقت سے کم نہ تھا۔ سرور صاحب نے ان سے چار سال تک عربی زبان وادب کی تعلیم حاصل کی تھی۔

سرور صاحب نے اپنی کتاب مولانا عبید اللہ سندھی میں اور شخصیات میں ان کے علم وفضل اور محاسن سیرت وفکر کا تذکرہ نہایت عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔

تعلیم سے فراغت

جامعہ کے علمی ماحول، سیاسی فضا اور قدیم وجدید علوم وافکار کے ماہرین اور بزرگوں کی صحبت نے سرور صاحب کی زندگی، تہذیب اور ان کے افکار کی تربیت میں خاص حصہ لیا۔ ۱۹۲۸ میں انھوں نے بی اے آنرز (عربی) کا امتحان پاس کیا اور مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ھمدرد سے وابستہ ہو گئے۔ ھمدرد سے ان کا تعلق صرف چند ماہ رہا۔ مولانا محمد علی اس وقت علاج کی غرض سے یورپ گئے ہوئے تھے، جب وہ یوروپ سے لوٹ آئے تو سرور صاحب جامعہ میں آ گئے اور اس کے تدریسی عملے سے وابستہ ہو گئے۔

مصر کا تعلیمی سفر

۱۹۳۰ء میں انھیں مصر جانے اور جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل گیا، جامعہ ازہر میں تعلیمی مصروفیات کے ساتھ انھوں نے جامعہ کے بعض پروفیسروں سے بھی استفادہ کیا اور ایک مدت تک ان کے لیکچروں میں شریک ہوتے رہے۔ یہیں انھیں ڈاکٹر طہٰ حسین اور احمد امین کے لیکچر سننے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر طہٰ حسین اور احمد امین اپنی روشن خیالی، ترقی پسندی، آزاد نقطہ نظر اور تجدد پسندانہ خیالات کے لیے کسی تعارف کے محتاج نہیں، سرور صاحب نے کھلے ذہن ودماغ سے ان کے خیالات کو سنا اور ان کے بعض علمی افکار سے متاثر بھی ہوئے۔ جامعہ ازہر میں تعلیم اور اہلِ علم کے لیکچروں میں شرکت کے علاوہ اسلامی اور علمی وفکری موضوعات پر کتب ورسائل کا مطالعہ بھی جاری رہا، اس زمانے میں قاہرہ سے ایک بلند پایہ علمی وسیاسی ہفت روزہ السیاسۃ نکلتا تھا، جس میں اس زمانے کے صف اول کے لکھنے والوں کے مضامین چھپتے تھے۔ سیاسی وعلمی حلقوں میں یہ ہفت روزہ بہت مقبول تھا۔ اس کے بلند پایہ علمی، فکری اور ادبی مضامین نے سرور صاحب کے ادبی ذوق ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ ان کے رجعت پسندانہ مزاج اور قدامت پرست فکر اور نقطہ نظر کو بھی متاثر کیا۔ السیاسۃ کے ایڈیٹر مصر کے مشہور مفکر محمد حسین ہیکل تھے، جو اپنی فکر ونظر اور علم ومطالعہ کی وجہ سے پورے عالم اسلام میں مشہور ہیں، ان کی مشہور کتاب حیاۃ محمدؐ کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے۔ برصغیر پاک وہند میں اردو ادب اور اسلامیات کا کوئی

طالب علم ایسا نہیں ہوسکتا جس نے ہیکل کا نام نہ سنا ہو۔ سرور صاحب نے مصر کے تعلیمی، تہذیبی، سماجی اور معاشرتی حالات اور اس کی اچھائیوں، برائیوں کو بہت قریب سے دیکھا، بلکہ ان میں رہ کر ان کی عملی زندگیوں میں مشاہدہ کیا اور کتابوں اور جریدوں کے حروف وسواد کے آئینے میں دیکھا۔ انھوں نے مصر پر انگریزوں کے جبر واستبداد کو بھی دیکھا اور مصریوں کی سیاسی زندگی کے انتشار، پسماندگی اور ذلت و بے یقینی کی حالت کو بھی سمجھا، چونکہ وہ اپنے پہلو میں ایک حساس دل رکھتے تھے اور اخاذ طبیعت کے مالک تھے اس لیے ممکن نہ تھا کہ یہ مطالعہ اور مشاہدہ ان کے ذہن ودماغ پر اپنے کچھ اثرات نہ چھوڑ جاتے۔

عالم اسلام کی سیاحت

مصر میں ساڑھے تین سال قیام کرنے کے بعد ستمبر ۱۹۳۳ء میں وطن واپس آئے۔ واپسی کا سفر خشکی کے راستے سے ہوا تھا، ایک نہایت ذہین اور بہت تیز انڈونیشی طالب علم شریک سفر تھا۔ اس کے ساتھ قاہرہ سے بیت المقدس گئے، تل ابیب اور دوسری یہودی بستیاں دیکھنے کا موقع ملا۔ شام اور لبنان میں چند دن رہے، عراق پہنچے اور دس روز بغداد میں گزارے، ان ممالک کی سیاحت کرتے، حالات دیکھتے اور وہاں کے اہلِ علم اور اصحابِ جرائد سے ملتے ہوئے آئے تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور افادات و ملفوظات میں انھوں نے مصر میں اپنے مطالعے اور مشاہدے کے تاثرات نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

زمیندار (لاہور) اور جامعہ ملیہ

وطن واپس آنے کے بعد ابتداءً آٹھ ماہ تک مولانا ظفر علی خان مرحوم کے اخبار زمیندار کے شعبہ ادارت سے وابستہ رہے، پھر وہ جامعہ ملیہ دہلی چلے گئے۔ سرور صاحب وہیں تھے کہ ۱۹۳۸ء میں سید ہاشمی فرید آبادی صاحب مرحوم جامعہ ملیہ دہلی پہنچے اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم شیخ الجامعہ کو بتایا کہ وہ اس سال حج کو گئے تھے، وہاں مولانا عبید اللہ سندھی سے ملاقات ہوئی تھی، انھوں نے پیغام بھیجا ہے:

> ”کیا معلوم مجھے ساری عمر یہیں رہنا پڑے اور وطن میں واپس نہ آسکوں
> اس لیے اگر جامعہ سے کوئی آجائے اور مجھ سے کچھ پڑھ لے تو کیا ہی

اچھا ہو۔"

ڈاکٹر صاحب مرحوم اس پیغام سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے جامعہ کے اساتذہ پر نظر ڈالی تو سرور صاحب اس خدمت کے لیے بہت موزوں نظر آئے اور اس طرح سرور صاحب مولانا سندھی کے مرید بن گئے۔

سرور صاحب کی حجاز روانگی

سرور صاحب کو اس وقت تک ھمدرد (دہلی) اور زمیندار (لاہور) اخبارات میں کام کرنے، مضامین محمد علی کی ترتیب اور علمی و ادبی و تعلیمی جراید میں مضمون نگاری کی وجہ سے تصنیف و تالیف کی مشق ہو چکی تھی اور اپنے وسیع مطالعے اور مصر اور دیگر اسلامی ممالک کے سفر و مشاہدے کی وجہ سے ان کے دماغ میں یہ صلاحیت پوری طرح پیدا ہو چکی تھی کہ وہ مولانا سندھی کی روشن خیالی، تلخ تجربات اور انقلابی افکار کے متحمل ہو سکیں اور ان کے علمی، تحقیقی اور ترقی پسندانہ خیالات کو سمجھ کر منضبط بھی کر سکیں۔ چناں چہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے انھیں حکم دیا کہ وہ فوراً حجاز پہنچ کر مولانا سندھی کی خدمت میں حاضر ہو جائیں، سرور صاحب دہلی سے بمبئی اور بمبئی سے پانی کے جہاز کے ذریعے جدہ روانہ ہو گئے اور جنوری ۱۹۳۹ء میں مولانا سندھی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

مولانا عبیداللہ انور نے لکھا ہے:

> "یہ سرور صاحب کی خوش نصیبی تھی کہ وہ مکہ معظمہ میں بھی مولانا سندھی سے مستفیض ہوئے اور مراجعت وطن کے بعد یہاں بھی پانچ برس تک مولانا سے شاہ ولی اللہ کی کتابیں تحقیق و محنت سے پڑھتے رہے اور ان کے افکار و خیالات سے استفادے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس دوران امام ولی اللہ اور مولانا سندھی پر برابر لکھتے بھی رہے۔ بعد میں شاہ صاحب کی بعض کتابوں کے انھوں نے نہایت عمدہ تراجم کیے اور خود سرور صاحب کی تصنیف ارمغان شاہ ولی اللہ اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب ہے جسے شاہ ولی اللہ کی کتابوں کا خلاصہ اور نچوڑ کہنا چاہیے اور علوم قرآنی کے طلبہ کے لیے تو وہ ایک نعمت ہے۔"[1]

مولانا سندھی کی وطن واپسی

جنوری ۱۹۳۸ء میں جب حج کے موقع پر ہاشمی فرید آبادی سے مولانا سندھی مرحوم کی ملاقات ہوئی تھی تو اس بات کا سان گمان بھی نہ تھا کہ اب وہ زندگی میں وطن لوٹ سکیں گے! اسی وجہ سے انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو پیغام بھیجا تھا کہ کسی استاد کو ان کے پاس بھیج دیں لیکن اسی سال کے دوران جب کہ ہندوستان کے بیشتر صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں تو مولانا سندھی کی جلا وطنی کے خاتمے کی تحریک پھر اٹھی۔ پنجاب سے مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے انقلاب کے ذریعے خاص طور پر اس مسئلے کو اٹھایا، مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم بھی ایک مدت سے ان کی واپسی کے لیے ساعی تھے۔ جمعیۃ علمائے ہند نے اس تحریک کی قیادت کی۔ شخصی طور پر بعض مسلم لیگی رہنماؤں نے بھی اس تحریک میں حصہ لیا۔ سر عبداللہ ہارون نے خاص طور دلچسپی لی۔ آخر کار معاملہ کسی صوبے کی گورنمنٹ کی ضمانت پر آکر رکا۔ یہ رکاوٹ سر غلام حسین ہدایت اللہ وزیر اعلیٰ صوبہ سندھ نے دور کردی۔ ۱۹۳۸ء کے آخر تک وطن واپس آنے کی پابندی ختم کردی گئی اور اس وقت تک کہ سرور صاحب مولانا سندھی کی خدمت میں پہنچیں، انھیں نہ صرف جلا وطنی کے خاتمے کی اطلاع دی جا چکی تھی بلکہ یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو انھیں وطن واپس آنے کے لیے پاسپورٹ بھی دے دیا گیا تھا۔ اس لیے حجاز میں سرور صاحب کو مولانا سندھی کی صحبت میں ایک ماہ بیٹھنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا کہ مولانا سندھی وطن واپس آگئے۔ ۷/ مارچ ۱۹۳۹ء کو تقریباً چوبیس سال کی جلا وطنی کے بعد مولانا سندھی وطن تشریف لائے۔ اس وقت خان بہادر اللہ بخش سومرو کی وزارت قائم تھی۔ وزیر اعلیٰ سومرو نے بہ نفس نفیس کراچی بندرگاہ پر مولانا کو خوش آمدید کہا تھا۔

سرور صاحب نے ارادہ کیا تھا وہ حجاز سے مزید مطالعہ و تحقیق کے لیے سوربرن (پیرس یونیورسٹی) چلے جائیں گے لیکن مولانا سندھی سے مشورے کے بعد انھوں نے رائے بدل دی اور مولانا کے ساتھ لوٹ آئے اور اگرچہ مستقل قیام ان کا جامعہ ملیہ دہلی میں رہا لیکن وہ متعدد سفروں میں بھی مولانا کے ساتھ رہے اور دہلی اور لاہور کے دوران قیام میں تو ان کے شب و روز کا بیشتر وقت مولانا سندھی مرحوم کی خدمت میں گزرا۔

احسان سے وابستگی

۱۹۴۲ء میں وہ جامعہ سے رخصت لے کر لاہور آ گئے تا کہ اپنے صوبے میں لکھنے پڑھنے کے ذریعہ کوئی سیاسی کام کیا جائے۔ وہ روزنامہ احسان کے ایڈیٹر ہو گئے۔ اس زمانے میں صحافت سے تعلق کی وجہ سے انھوں نے ملک کے سیاسی نشیب وفراز کو بہت قریب سے دیکھا، ان کا مطالعہ ظاہری خبروں تک ہی نہ رہا بلکہ ذاتی مفاد کے ٹکراؤ اور جوڑ توڑ، اندرونی سیاسی کشمکش سے بھی واقف ہونے کا انھیں موقع ملا۔ خصوصاً پنجاب کی سیاست اور حالات درون پردہ کے تو وہ راز دار بن گئے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں:

> ''میرے ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء کے سال لاہور میں گزرے۔ اس دوران صحافت اور بعض صحافی دوستوں سے تعلق کی وجہ سے سر سکندر حیات خاں اور قائدِ اعظم میں اندر ہی اندر جو کشمکش رہتی تھی اس کی تفصیلات کا مجھے کافی علم ہے، لیکن ان مباحث پر قلم اٹھانے کا ابھی وقت نہیں آیا، مولوی فضل الحق نے تو بعد میں قائدِ اعظم کے خلاف کھلم کھلا اعلانِ جنگ کر دیا تھا اور اس ضمن میں انھوں نے جو بیانات دیے تھے وہ اتنے سخت تھے کہ انھیں آج چھاپنا مشکل ہوگا۔''

احسان سے وہ تقریباً دس ماہ وابستہ رہے تھے، اس دوران میں انھوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس کا تذکرہ اختصار کے ساتھ افادات وملفوظات مولانا عبیداللہ سندھی کے پیش لفظ میں کیا ہے۔

قیام پاکستان

۱۹۴۳ء میں وہ پھر جامعہ ملیہ چلے گئے اور یہ وابستگی ۱۹۴۷ء تک رہی، انھیں جامعہ اور اسلامی ہند کے مرکز دہلی سے دلی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا، انھوں نے دہلی میں ایک مکان بھی بنالیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ ایک مہاجر کی طرح لٹ لٹا کر لاہور آ گئے اور اس وقت سے لے کر اب تک لاہور میں مقیم ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں روزنامہ امروز (لاہور) سے وہ منسلک ہو گئے۔ پھر

اپنے بعض دوستوں کے اشتراک سے ہفت روزہ آفاق نکالا۔ ۱۹۵۸ء میں وہ ایک ماہنامہ نکالنے کا سرو سامان کر رہے تھے، بلکہ ڈیکلریشن بھی لے لیا تھا کہ انھیں دنوں ایوب خان نے ملک کی زمام اقتدار سنبھالی اور مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ ملک کے حالات غیر یقینی ہو گئے اور اس وجہ سے ماہنامہ نکالنے کا خیال شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا، مجبوراً بانگِ حرم (پشاور) سے وابستہ ہو گئے۔ اس سے پہلے وہ کچھ مدت تک حکومت کے پریس انفارمیشن ڈپارٹمنٹ سے بھی وابستہ رہ چکے تھے۔

الرحیم حیدر آباد کی ادارت

۱۹۶۳ء میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد میں قائم ہوئی تو سرور صاحب کو اس کے علمی مجلّہ ماہنامہ الــرحیــم کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا اور اوائل ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۴ء کے آخر تک وہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی (حیدر آباد) سے وابستہ رہے، انھوں نے الــرحیــم کو نہایت سلیقے سے مرتب کیا اور پاکستان کے بہترین علمی مجلوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ انھوں نے نہ صرف خود اس میں بہترین مقالات لکھے بلکہ پاک و ہند کے بہترین لکھنے والوں کے تحقیقی مقالات اور علمی مضامین سے الرحیم کے صفحات کو ہم پایہ برھان (دہلی) و معارف (اعظم گڑھ) کر دیا۔

فکر و نظر کراچی و اسلام آباد

لیکن شیخ محمد اکرام مرحوم جو اس زمانے میں محکمہ اوقاف پاکستان کے ایڈمنسٹریٹر تھے، اور سرور صاحب کو شاہ ولی اللہ اکیڈمی میں لائے تھے، کسی اور محکمے میں تبدیل ہو گئے تو سرور صاحب بھی اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہو گئے۔ انسٹی ٹیوٹ اس زمانے میں کراچی میں تھا۔ سرور صاحب کو یہاں بھی اس کے علمی مجلّہ ماہنامہ فکر و نظر کی زمام ادارت سونپی گئی۔ ۱۹۷۰ء تک اس کی ادارت کی ذمہ داریوں کو انھوں نے بحسن وخوبی انجام دیا۔ فــکــر و نــظــر کے علمی معیار اور کمال ترتیب و تہذیب کے لحاظ سے یہ اس کا بہترین دور تھا۔ اس سے پہلے اس کا کوئی علمی معیار اور انداز مقرر نہ ہو پایا تھا اور بعد میں وہ معیار برقرار نہ رہا۔ ۱۹۶۶ء میں انسٹی ٹیوٹ کے انتقال مکانی سے انھیں خوشی ہوئی لیکن کراچی میں ان کے نیاز مندوں کو اس کا غم بھی تھا کہ سرور صاحب سے ملاقات کی سہولت باقی نہیں رہی

اوران کی دلچسپ صحبتوں سے محظوظ ہونے اوراستفادہ کرنے کی مہلت ختم ہوگئی۔

المعارف لاہور کی ادارت

شیخ محمد اکرام صاحب سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر مقرر ہو چکے تھے، ان کا کام چونکہ کسی علمی ادارے میں ایک قابلِ اعتماد صاحبِ علم وقلم کے بغیر چل نہیں سکتا تھا، سرور صاحب کی شرافت ووضع داری اوران کے علم ومطالعہ پرانھیں اعتماد تھا اس لیے انھوں نے کوشش کر کے سرور صاحب کو ماہنامہ ثـقـافـت کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے ثـقـافـت کا نام بدل کر الـمـعـارف کردیا تھا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر رئیس احمد جعفری مرحوم تھے، جن کا اکتوبر ۱۹۶۸ء میں انتقال ہو چکا تھا اور یہ جگہ درحقیقت کسی اہل ایڈیٹر کی منتظر تھی، سرور صاحب کا تقرر اس کے لیے نہایت موزوں تھا۔ الـمـعـارف سے وہ تقریباً دوسال وابستہ رہے لیکن جیسی آزادی انھیں الـرحیـم کی ادارت میں تھی، یہاں انھیں میسر نہ تھی۔ شیخ اکرام صاحب مرحوم قدم قدم پران کے لیے رکاوٹ بنے ہوئے تھے، شیخ صاحب سرکاری ملازمت سے ریٹائرڈ ہوئے اور ایک علمی ادارے سے وابستہ ہونے کے باوجود آفیسرانہ مزاج نہ بدل سکے، کچھ اور وجوہ کی بنا پر بھی اہلِ علم کا ایسا حلقہ نہیں بن سکا جس کا تعاون الـمـعـارف کو حاصل ہوتا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن ولولوں سے انھوں نے ثـقـافـت کا نام تبدیل کر کے الـمـعـارف رکھا تھا اور قارئین کے دلوں کو گرمایا تھا وہ امیدیں پوری نہ ہوسکیں، نہ تو وہ ایک محدود دائرے سے نکل سکا، نہ اس کی علمی سطح بلند ہوسکی اور نہ سرور صاحب ہی اس کے لیے جو کچھ کر سکتے تھے، کرسکے۔

الـمـعـارف کی ایڈیٹری کے علاوہ اسی دوسال کے عرصے میں انھوں نے ارمـغـانِ شاہ ولی اللہ کے نام سے ایک نہایت مفید کتاب مرتب کی۔

موجودہ اوقات فرصت

۱۹۷۱ء کی جولائی میں ان کا تعلق ادارہ ثقافت اسلامیہ سے ختم ہوگیا۔ اس وقت سے ان کا زیادہ تر وقت تصنیف وتالیف کے مشغلے میں بسر ہوا۔ افـادات و مـلـفـوظات مولانا عبید اللہ

سندھی، ان کے انھیں اوقات فرصت کا ثمر شیریں اور ان کی تالیفات میں شاہکار ہے۔

مولانا سندھی مرحوم سے انھیں بڑی عقیدت ہے۔ ان کے افکار و افادات کو تاریخ افکار اسلامی کا وہ بہت بڑا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ ان کی تالیفات میں بیشتر تالیفات، مرتبات اور بلند پایہ مضامین مولانا سندھی مرحوم سے متعلق ہیں، مولانا سندھی مرحوم سے علمی وفکری تعلق کا نتیجہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے علوم و افکار کو انھوں نے اپنے مطالعہ ونظر اور تحقیق وتصنیف کا موضوع بنایا۔

مولانا سندھی سے تعارف

مولانا سندھی سے سرور صاحب کی واقفیت اور تعلق حادثاتی نہیں ہے جیسا کہ اوپر کی سطروں سے شبہ ہوسکتا ہے، سرور صاحب نے ۱۹۲۰ء سے جو فکری سفر اختیار کیا تھا اس میں جو شخصیت سب سے نمایاں رہی ہے وہ مولانا سندھی کی ہے۔ مولانا سندھی کی عقیدت اور ان کی انقلابی شخصیت کا نقش ۱۹۲۰ء میں ان کے دل پر ثبت ہو گیا تھا۔ جب وہ آزاد مسلم ہائی اسکول گجرات میں زیر تعلیم تھے، ان کے استادوں میں سے دو استاد بیک واسطہ مولانا سندھی کے شاگرد تھے، یعنی مولانا نصر اللہ خاں عزیز اور ملک حسن علی، ان دونوں بزرگوں نے خواجہ عبدالحی فاروقی سے قرآن حکیم کا درس لیا اور خواجہ صاحب نے مولانا سندھی سے علوم و معارف قرآن حکیم میں استفادہ کیا تھا۔ اس لیے ان بزرگوں کی صحبتوں میں مولانا سندھی کا نام اور ان کی شخصیت سرور صاحب کے لیے اجنبی نہ رہی تھی بلکہ مولانا سندھی کے انقلابی افکار اسی زمانے میں ان کے ذہن پر مرتسم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ پھر جب وہ جامعہ ملیہ گئے تو وہاں کی دینی انقلابی فضا میں مولانا سندھی کی اولوالعزمیوں، ولولہ انگیزیوں اور جوش اسلامی کی گونج موجود تھی۔ ان حالات میں ممکن نہ تھا کہ سرور صاحب اپنے ذہن اور دماغ کے دریچوں کو باہر کی ہوا سے بند کر لیتے۔ اس زمانے میں سرور صاحب کا جتنے اکابر سے تعارف ہوا وہ تمام مولانا سندھی کے شناسا اور ان کے منصوبے کے ہمراز و آشنا تھے، یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب سرور صاحب مصر گئے تو وہاں بھی مولانا سندھی کے نام کی شہرت سنی اور عجیب طریقے سے، سرور صاحب لکھتے ہیں:

> ''جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے فارغ ہونے کے بعد مصر جانے کا موقع ملا۔
> جامعہ ازہر میں داخلہ لیا اور ایسے ہوسٹل میں جگہ ملی جہاں انڈونیشی طلبہ تھے۔

> یہ طالب علم اکثر وطن سے پہلے حجاز آتے اور پھر ازہر کا قصد کرتے، ایک دفعہ ایک انڈونیشی طالب علم قاہرہ پہنچے، ان کے بارے میں انڈونیشی طلبہ میں بڑے زوروں سے یہ چرچا کیا گیا کہ اس نے مکہ میں کسی شیخ ہندی سے پڑھا ہے اور وہ عجیب عجیب باتیں کرتا ہے ایک بات جو اس کے متعلق بڑی مشہور ہوئی وہ یہ تھی کہ ہمارے شیخ نے کہا ہے کہ صحیح بخاری حدیث کی اصح الکتب نہیں، بلکہ اصح الکتب امام مالک کی مؤطا ہے، اس انڈونیشی طالب علم نے مکہ میں سندھی سے استفادہ کیا تھا۔"[۲]

مصر سے واپسی کے بعد زمیندار (لاہور) سے وابستگی کے زمانے میں اور پھر جامعہ ملیہ کی پروفیسری کے زمانے میں جس گرد و پیش میں انھوں نے زندگی گزاری تھی اس میں کوئی شخص مولانا سندھی کی شخصیت سے ناواقف نہیں رہ سکتا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں تقریباً پورے ملک کے حریت پرست اخباروں، جماعتوں اور رہ نماؤں نے ان کی جلاوطنی کے خاتمے کے لیے تحریک شروع کر دی تھی، یہ سرور صاحب کے سامنے کی بات تھی۔

مولانا سندھی کی خدمت میں حاضری

سرور صاحب جنوری ۱۹۳۹ء میں مولانا سندھی مرحوم کی خدمت میں پہنچے تو مولانا کی انقلابی شخصیت اور ملک کی آزادی کے لیے ان کی خدمات سے پوری طرح باخبر تھے اور اردو، انگریزی، عربی زبانوں سے واقفیت اور مختلف سیاسی جماعتوں اور افراد کی خدمات سے آگاہی بھی حاصل تھی۔ غرض کہ علم و مطالعہ اور فکر و نظر کی دولتوں سے آراستہ ہو کر مگر طالب علمانہ جذبے کے تحت پہنچے تھے، لیکن ان کے علم و مطالعہ اور فکر و نظر کی حیثیت مولانا سندھی مرحوم جیسی شخصیت کے سامنے کیا تھی جو گزشتہ ۲۳، ۲۴ برس سے ملک سے دور تھی، جن کا نہ ملک کی سیاسیات سے براہِ راست تعلق تھا، نہ معلومات کے ان کے پاس آج کل جیسے بہترین ذرائع تھے۔ اس کی روداد سرور صاحب ہی کی زبانی سنیے، لکھتے ہیں:

> "میں جب مکہ معظمہ میں مولانا سندھی کی خدمت میں پہنچا تو تھوڑا بہت پڑھا تھا، میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے بی اے آنرز (عربی) کیا تھا

اور کوئی ساڑھے تین سال قاہرہ میں جامعہ ازہر میں پڑھا تھا۔ایک سال میں جامعہ مصریہ قاہرہ میں ڈاکٹر طہٰ حسین، احمد امین اور بعض دوسرے اساتذہ کے محاضرات (لیکچرز) میں بیٹھا تھا، واپسی پر تقریباً چار سال تک جامعہ میں پڑھا چکا تھا، تھوڑا بہت عام مطالعہ بھی تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ جامعہ کا علمی ماحول میسر تھا جہاں بڑے بڑے علماوفضلا موجود تھے، جن سے استفادہ کا پورا موقع ملا تھا، اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ جب میں مولانا کی خدمت میں ان کے گھر پر حاضر ہوتا، وہ گفتگو شروع کرتے اور بعض دفعہ مسلسل کئی کئی گھنٹے بولتے رہتے تو میری یہ حالت ہو جاتی کہ جیسے جو کچھ پہلے پڑھا تھا، وہ ذہن سے دھل گیا ہے اور یہ جواب سن رہا ہوں، اس کا کچھ اتا پتا نہیں چلتا۔ ہندوستان کی سیاسیات پر باتیں کرتے، عربوں اور ترکوں کا ذکر تک آتا، اسلام کی تاریخ کا جائزہ لیا جاتا، قرآن کے بعض نکات ارشاد فرماتے، روایات پر جرح ہوتی، قدیم معتقدات پر تنقید کرتے، غرض نو بہ نو افکار وخیالات کا ایک سیلاب تھا، جو مضبوط بند توڑ کر بڑی بڑی سیاسی و دینی شخصیات، صدیوں کے مروجہ عقائد و روایات اور تاریخی عقیدتوں اور نظریات کو اپنے زبردست دھارے میں بہائے لیے جانا محسوس تک ہوتا، اس دوران میں بہت کم بولتا بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ مجھے یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ جب مولانا اس عالم جذب میں گفتگو فرما رہے ہوں تو میں ان کے سامنے زبان کھول سکوں، ایک دماغ جس میں اسلام کا سارا نقلی و عقلی سرمایہ علم ہو اور اس میں برسوں کے بڑے بڑے عملی و سیاسی سنگین اور تلخ تجربے بھی شامل ہوں، ایک دل جو ماضی اور حال کے شدید صدموں سے دکھی ہو، آنکھیں جو آنے والے دور کی ہولناکیاں دیکھ رہی ہوں، یہ احساس کہ کسی کو ان خطرات کی فکر نہیں اور سب وقتی اور غیر اہم باتوں میں الجھے ہوئے ہیں، ایک عام مایوسی اور اس پر قدرتاً انتہائی برہمی اور ساتھ ہی یہ

جذبہ کہ اگر میری باتیں سن لی جائیں اور مجھے کام کا موقع ملے تو میں کشتی کو منجدھار سے نکال کر سلامتی کے ساحل کی طرف لے جا سکتا ہوں، ایک طرف اپنے اوپر یقین اور دوسری طرف گردو پیش کے اتنے مایوس کن حالات اوران میں اپنے لیے کہیں سے بھی سازگاری کی کوئی امید کی کرن نظرنہیں آرہی، مختصراً یہ کیفیت ہوتی تھی مولانا کی جب وہ کبھی کبھی مجھ سے کئی کئی گھنٹے خطاب فرماتے۔ میں دم بخود ہوتا اور وہ بولتے چلے جاتے۔ ان کے الفاظ انگارے ہوتے، ان کے افکار میرے ذہن وقلب کے پہلے کے بنے ہوئے، بتوں کو مسمار کرتے جاتے، شخصی بتوں اوراعتقادی بتوں کو بلکہ ان فکری ضربوں سے خود میری اپنی شخصیت بھی جو اتنے برسوں کی جانکاہی اور کئی عوامل ومحرکات سے بھری پڑی تھی، ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی۔ سچی بات یہ ہے کہ مولانا سندھی کی خدمت میں میری حاضری پہلے پہل تو میرے لیے تخریب ہی کی حامل بنی، پہلے کے نقش اور تاثرات ذہن وقلب سے مٹے زیادہ اور نئے بنے کم، اور دوسرے الفاظ میں یہ ''لا'' کا عمل تھا تا کہ ''الا'' کی راہ صاف ہو سکے۔[۳]

مولانا سندھی سے استفادہ

ہندوستان واپس آنے کے بعد بھی مولانا سندھی مرحوم سے استفادے کا سلسلہ جاری رہا، معمول یہ تھا کہ سرور صاحب کو جب کبھی مولانا کی خدمت میں باریابی ملتی، مولانا مذہب، سیاست، تاریخ ،تصوف وغیرہ کا کوئی موضوع انتخاب فرمالیتے اوراس پر گفتگو شروع کر دیتے، سرور صاحب چپ چاپ بیٹھے سنتے رہتے، کبھی کوئی بات واضح نہ ہوتی یا ان کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ مولانا سے پوچھ لیتے۔ مولانا نہایت شرح وبسط سے اس کا جواب دیتے اور ایک ایک نقطے کی پوری وضاحت فرماتے ،بعض دفعہ یہ محبت تمام تمام دن جاری رہتی، بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ مولانا نماز صبح کے بعد جو بیٹھے تو سارا دن تعلیم و ارشاد فرماتے گزار دیا۔ مجلس ختم ہوئی تو سرور صاحب مکان پر پہنچ کر مولانا کے ان ارشادات کو اپنی

یادداشت سے قلم بند کر لیتے، سرور صاحب کا بیان ہے:

> ''مولانا کے حضور میں کچھ لکھنا ممکن نہ تھا، ایک دو دفعہ میں نے کوشش بھی کی لیکن ایک تو اس طرح لکھنے سے مولانا کے انہماک اور یکسوئی میں خلل آتا اور دوسرے گفتگو اتنی مؤثر اور دل ودماغ کو مسحور کرنے والی ہوتی کہ ذہنی تاثرات کو اسی وقت قید تحریر میں لانا میرے لیے مشکل ہو جاتا، ناچار مجھے اپنے حافظے ہی پر انحصار کرنا پڑا۔''

یہ بات سرور صاحب نے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم پر اپنی کتاب کے پیشِ لفظ میں لکھی ہے۔ یہ کتاب مولانا کے حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار کے موضوع پر ہے اور مولانا سندھی مرحوم کی زندگی ہی میں اکتوبر ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ مولانا مرحوم نے اسے پسند فرمایا تھا۔ چونکہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد سرور صاحب کے بارے میں مولانا سندھی مرحوم کی رائے بہت اچھی ہوگئی اور انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ان میں نہ صرف ان کی باتوں کو سمجھنے کی استعداد ہے بلکہ وہ ان کی ترتیب اور پیش کش کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔

افادات وملفوظات

اس کے بعد مولانا سندھی ان سے نازک سے نازک مسئلے پر اور کھل کر باتیں کرنے لگے۔ اور سرور صاحب حسبِ دستور سابق ان گفتگوؤں اور باتوں کو مرتب کرتے رہے، تا آنکہ مولانا کی زندگی ہی میں مختلف موضوعات، سیاست، مذہب، تصوف، تاریخ اور بعض ان کی معاصر شخصیات اور بعض اسلاف کے بارے میں ملفوظات، افکار، ان کے تاثرات اور مطالعہ ومشاہدے کا اتنا ذخیرہ ہو گیا کہ ۱۸×۲۲ سائز پر ۵۱۲ صفحے کی ایک عظیم الشان تالیف ہمارے سامنے ہے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد مولانا مجھ پر اور شفقت فرمانے لگے، وہ دل سوزی سے پڑھاتے، گفتگو کرتے تو گھنٹوں کرتے رہتے، نازک سے نازک مسئلے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے، کبھی کوئی خاص بات کہتے تو فرما دیتے کہ اسے اس وقت شائع کرنا جب تم فضا سازگار پاؤ، مولانا کے

یہ ارشادات راقم الحروف یادداشتوں کی شکل میں قلم بند کرتا جاتا تھا۔ اگست ۱۹۴۴ء میں مولانا نے وفات پائی۔ آخری دنوں میں میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور وعدہ کیا کہ آپ کے تازہ ارشادات پر مشتمل ایک دوسری کتاب جلد ہی مرتب ہو جائے گی لیکن بدقسمتی سے وہ ان اٹھائیس سالوں میں مرتب نہ ہو سکی، اس طویل مدت میں اپنے محترم بزرگ سے کیا ہوا یہ وعدہ مجھے برابر یاد رہا۔ کئی دفعہ میں نے ان یادداشتوں کو نکالا، پڑھا اور انھیں مرتب کرنے کا ارادہ کیا، لیکن وہ چیز جسے باطنی تحریک کہتے ہیں اور جو کسی کام کو کرنے پر اس طرح ابھارتی ہے کہ آدمی کو اسے کیے بغیر بن نہیں پڑتا، وہ میسر نہ ہوئی اور یہ کام شروع نہ کیا جا سکا۔[۴۲]

اس کے بعد سرور صاحب نے ۱۹۴۴ء کے بعد سے لے کر ۱۹۷۰ء میں پاکستان میں پہلے عام انتخابات تک کے حالات اور ملک میں اسلام پسندوں کی پیدا کی ہوئی فضا اور اس کے نتائج پر توجہ دلائی ہے اور مولانا سندھی مرحوم کے افادات و افکار کے مطالعے کی ضرورت اور ملک کی تعمیر و ترقی میں ان سے رہنمائی کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

ایک سچا انقلابی

مولانا عبیداللہ سندھیؒ حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے، دارالعلوم دیو بند میں انھوں نے تعلیم حاصل کی، مذہبی عقائد میں ان کا مسلک وہی تھا جو علمائے دیو بند کا ہے، اگر انھیں کسی جماعت سے وابستہ کیا جانا ضروری ہو تو وہ دیو بندی ہیں لیکن وہ چونکہ جمود کے سخت ترین مخالف ہیں اور کسی جماعت کو تقدس کا درجہ دینا نہیں چاہتے نیز اس وجہ سے کہ وہ ایک مفکر اور انقلابی ہیں، اس لیے وہ کسی فکر یا کسی جماعت کے مقلد اعمی نہیں بن سکے۔ اس لیے وہ دیو بندی جماعت کو بھی مطمئن نہیں کر سکتے اور انھیں اس کی کوئی پرواہ بھی نہیں اور ایسی صورت میں کہ وہ دیو بندی جماعت کی بھی پرواہ نہیں کرتے تو کسی دوسری جماعت کی کیوں کر پرواہ کر سکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان سے کوئی خوش نہیں لیکن وہ چونکہ کسی ایک جماعت کے نقطۂ نظر کو پوری طرح اپناتے نہیں ہیں، اسی طرح ان کا جماعتی تعصب کلیتہً کسی

جماعت کا اصل وفرع اور اصول ونظام میں رد بھی نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ مختلف مکاتب فکر کو ان سے جہاں شدید اختلاف پیدا ہوتے ہیں وہیں ان کے افکار وملفوظات میں ان کی دلچسپی کی باتیں بھی بہت سی مل جاتی ہیں، مثلاً مولانا سندھی قرآن مجید کے تعزیراتی احکام جیسے قطع ید وغیرہ اور حدیث میں جو رجم (زانی اور زانیہ کو سنگسار کرنے) کی سزا مروی ہے یا حدیث وسنت میں بعض انتظامی معاشرتی اور معاشی امور مثلاً زکوۃ کی شرح کی جس طرح تعیین اور تحدید کی گئی ہے انھیں ابدی اور غیر مبدل نہیں مانتے، زمانہ حال کے مجددین اسلام اس سے بہت خوش ہوں گے لیکن بعض جماعتوں کی اسلام پسندی اور اس کے مضمرات کے بارے میں ان کے خیالات پڑھیں گے اور اندازہ کریں گے کہ یہ ایک صحیفہ افادات و ملفوظات ان کے افکار اور فلسفے کے قصر وکسریٰ کے لیے وہ ضربت اسلامی ہے جس کے لیے ان کے پاس کوئی ڈھال نہیں، تو وہ حسبِ سابق ان کے خلاف اشتعال انگیز مضمون لکھیں گے اور انھیں کافر، فاسق اور ملحد و بے دین ثابت کرنے کی کوشش کریں گے اور زمانہ حال کی اصطلاحوں میں کانگریسی، ہندو کا ایجنٹ، پاکستان کا دشمن، نظریہ پاکستان کا مخالف، کمیونسٹ، اشتراکیت نواز، طاغوت کا معاون وغیرہ کے خطابات سے نوازا جائے گا۔

اسی طرح جب سیکولرازم، سوشل ازم کے حامی مولانا کے سیاسی، معاشرتی، معاشی افکار کا مطالعہ کریں گے تو بہت خوش ہوں گے لیکن جب انھیں معلوم ہوگا کہ مولانا اپنے تمام ترقی پسندانہ خیالات کے باوجود زندگی سے متعلق کسی بھی لائحہ عمل کا مذہب کے بغیر تصور ہی نہیں کر سکتے تھے، تو ان کے لیے مولانا کی حقیقت ترقی پسندی کا اعتراف تو درکنار ان کے لیے مولانا ایک نا قابلِ برداشت شخصیت ہوں گے۔ وہ مولانا کی اس مذہبی فکر کو اپنے اشتراکی نظام کے لیے سخت خطرناک اور اس کتاب کا مطالعہ ممنوع قرار دیں گے۔

حقیقت پسند مسلمان

مولانا سندھی مرحوم کے سیاسی، سماجی اور معاشی نظریات پر بحث کرتے ہوئے اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے کہ مولانا سندھی ایک مذہبی آدمی تھے اور وہ زندگی سے متعلق کسی بھی لائحہ عمل کا مذہب کے بغیر تصور ہی نہیں کر سکتے تھے، لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ سیاسی اور سماجی معاملوں

میں خواہ مخواہ مذہب کو استعمال کیا جائے اور لوگوں کے جذبات کو مشتعل کیا جائے۔ان کے خیال میں سیاسی وسماجی مسائل کے حل کے لیے جس نقطہ نظر کی ضرورت ہوتی ہے وہ مذہبی جذباتیت میں نہیں مل سکتا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو مذہبی جذبات ذہن وعقل پر غالب آجاتے ہیں اور محض جذبات ہمیں کسی صحیح نتیجے تک پہنچانے میں مفید ثابت نہیں ہوتے یا سیاسی وسماجی مسائل میں مذہب کا تقدس باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ پاکستان کے پچھلے انتخابات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام پسند تحریک کے رہنماؤں نے محض انتخاب جیتنے کے لیے بعض پارٹیوں سے مقابلے کو نہایت زور وشور کے ساتھ اسلام اور کفر کی جنگ قرار دیا، وہ اپنے جوش مخالفت میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ جمعیت علمائے اسلام کے متعدد رہنماؤں کے خلاف بھی اشتراکیت اور سوشلزم نوازی کے الزام میں دائرۂ اسلام سے اخراج کا فتویٰ دیا اور جمعیت کے جن رہنماؤں کے خلاف سوشلزم نوازی میں کفر کا فتویٰ دیا تھا، جب ان کے اسلام کے خلاف اسی سوشلزم نواز جماعت کا ایک عالم دین جیت گیا تو اسی اخبار نے اسی رہنما کی پورے صفحے کی تصویر چھاپی جس کے نیچے علامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر درج کر کے اس کے کمال عزیمت ودعوت اور رسوخ ایمانی کی داد دی:

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ!

تحریک پاکستان کے زمانے میں جس طرح مذہب کے نام کو استعمال کیا گیا تھا اور کامیابی حاصل کی تھی، اسلام پسندوں نے وہی حربہ آج استعمال کرنا چاہا اور اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ اس وقت مقابلہ ہندوؤں سے تھا آج مقابل مسلمان ہیں۔اس لیے جو ہتھیار اس وقت کارگر ہو سکتا تھا، آج کے دور میں اور خصوصاً مسلمانوں ہی کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ سرور صاحب ۱۹۴۶ء کی سیاسی فضا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مولانا سندھی اس طرح کی، مذہبی سیاست کے سخت مخالف تھے، ان کی بنیادی فکر یہ تھی کہ یہ دور ملک ووطن پر قائم قومی، جمہوری اور سیکولر حکومتوں کا ہے اور ایسی حکومتیں اس زمانے میں اسلام کی حقیقی روح اور اس کے عوامی و عالم گیر اصولوں کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں، وہ عوام کی سیاسی جدو جہد کو فرقہ

وارانہ مذہب کے بجائے قومی و معاشی آزادی کی بنیادوں پر چلانے کی دعوت دیتے تھے۔"

آگے چل کر سرور صاحب نے مولانا کے خیالات کی ان الفاظ میں ترجمانی کی ہے:

"مولانا فرمایا کرتے تھے کہ جس صنعتی دور میں ہم داخل ہو رہے ہیں، اس سے پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم اس میں آگے جائیں گے اور آگے جائیں گے، اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اب اگر آپ اس آنے والے صنعتی دور میں اپنی زندگی سے اسلام کو خارج کرنا چاہتے اور اس کی روحانی و اخلاقی قدروں اور تاریخی و اجتماعی تسلسل کو ضروری سمجھتے ہیں، تو اس فکر کو مشعل راہ بنائیے، یہ فکر میری نہیں، میری ایجاد کردہ نہیں، یہ دراصل شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی فکر ہے جس کی میں نے آج کے دور کے لیے نئی تعبیر کی ہے، مولانا سندھی کو اس پر اصرار تھا اور وہ ہمیشہ اس نام سے اپنے اس فکر کا تعارف کراتے تھے۔ وہ اس سلسلے میں شاہ صاحب کی کتابوں کے حوالے دیتے اور اپنے ہر بنیادی خیال کی اصل کی ان کی تعلیمات میں نشان دہی کرتے، مولانا نے سالہا سال شاہ صاحب کی کتابوں کا بغور مطالعہ کیا تھا اور ولی اللٰہی فکر کی توضیح و ترتیب اور تلخیص و تنقید میں اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کیا تھا۔ چنانچہ وہ فرماتے تھے کہ میرے اس فکر کی تاریخ ہے اور اس تاریخ کے سرے بہت دور ماضی میں جاتے ہیں، اس لیے آج کے اسلامی ذہن کو اسے قبول کرنے میں جھجک نہیں ہونی چاہیے۔[۵]

مولانا سندھی اور یورپین ازم

مولانا سندھی یورپین ازم کے دل دادہ ہی نہیں اس کے داعی بھی ہیں، لیکن ہمارے نزدیک اس کے دو درجے ہیں:

۱۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں اہلِ یورپ کی ترقی کو نمونہ بنانا اور اس سے فائدہ اٹھانا۔

۲۔ ان کے طرز بود و ماند، وضع ولباس اور طعام کے طور طریقوں کو اختیار کرنا۔

جہاں تک پہلے درجے کا تعلق ہے تو بلا شبہ ہمیں ان کی ترقی سے سبق سیکھنا چاہیے اور جب تک ہم خود سائنسی ایجاد کے قابل اور ٹیکنالوجی میں ماہر نہیں ہو جاتے، ہمیں بے جھجک ان کی تحقیقات، ان کی ایجادات اور ان کی مہارت فنی سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو اپنا نقصان کرتے ہیں۔

دوسرے درجے میں بھی جہاں تک مولانا سندھی مرحوم کے اخلاص کا تعلق ہے، اس سے تو انکار نہیں لیکن ان باتوں کو اختیار کرنے میں مولانا کے اصرار کی افادیت میں ہمیں شبہ ہے۔ ہمارے خیال میں یہ چیز زائد ہے۔ اس باب میں مولانا کے تشدد کو ہم انتہا پسندی کے سوا کچھ اور نہیں کہہ سکتے۔ درحقیقت یہ ہمارا مسئلہ ہی نہیں، یہ بات ہم نہ مذہبی تقشف کی بنا پر کہہ رہے ہیں، نہ تو ہمیں یورپین لباس اور مغربی آدابِ طعام کے جواز وعدمِ جواز کے نقطۂ نظر سے مولانا مرحوم کی رائے سے اختلاف ہے۔ ایک ادیب کسی معاشرتی وسماجی یا تہذیبی مسئلے پر اس حیثیت سے نظر ڈالتا ہی نہیں! مولانا کی اس رائے سے اختلاف کے باوجود ان کے یہ بات کہنے کے استحقاق سے بھی انکار نہیں کرتے، یہ بات کہنے کے لیے ان کے پاس جواز بھی ہے، ہماری رائے میں مولانا ایک انقلابی ہیں۔ ایک انقلابی کے لیے فکر ورائے میں تشدد اور کسی حد تک انتہا پسند ہونا ضروری ہوتا ہے۔ مولانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کسی طرح روایت پرستی کے حصار سے نکلیں اور ان کی زندگی کا جمود ٹوٹے! اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کریں جس سے مسلمانوں میں زندگی کی حرکت پیدا ہو، اس کے لیے مولانا ان کے احساسات کو جھنجھوڑتے ہیں اور جذبات کو اشتعال میں لانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اصل مسئلہ ہیٹ لگا لینے، یا پتلون اور تسموں والے جوتے پہننے کا نہیں ہے لیکن اگر وہ اس سے زیادہ کے متمنی نہ ہوں تو کم سے کم جو دراصل مطلوب ومقصود ہے وہ بھی حاصل نہ ہوگا۔ اس لیے دونوں سطحوں پر یورپین ازم کو اپنانے کی دعوت کا مقصد مسلمانوں کو جھنجھوڑنا اور بیدار کرنا ہے۔ یہ پہلو بھی نظر میں رہنا چاہیے کہ اس وقت کے اسلامی ہند اور افغانستان کی قدامت پرستی کے خلاف درحقیقت یہ مولانا سندھیؒ کا شدید ردعمل تھا۔

یورپین لباس

اس مبحث کی کچھ سطریں لکھ چکا تھا کہ مولانا سعید اکبرآبادی کا ایک مضمون نظر سے گزرا، اس میں انھوں نے یورپین لباس اختیار کرنے کے بارے میں مولانا سندھیؒ کا فلسفہ بھی بیان کیا ہے، اس سے مولانا مرحوم کی بصیرت اور دوررسی کا نقش دل پر ثبت ہوگیا۔

مولانا اکبرآبادی لکھتے ہیں:

''آپ (مولانا سندھیؒ) فرماتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی سے قبل یورپ میں ہندوستان کی طرح ڈھیلے ڈھالے لباس پہنے جاتے تھے۔ لیکن جب وہاں صنعت وحرفت کی ترقی کا دور شروع ہوا تو اس کی مناسبت سے زیادہ چست اور مستعد لباس پہنا جانے لگا جو آج ہر جگہ رائج ہے، پس اگر ہندوستان (اور اب پاکستان) کو بھی صنعتی ملک بننا ہے اور لازمی طور پر بننا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی پرانی وضع کے ڈھیلے ڈھالے لباس کو خیرباد کہے اور یورپ کا لباس پہنے، اس سلسلے میں مولانا جو ایک اہم نکتہ بیان کرتے تھے اس کا ذکر ضروری ہے، فرماتے تھے کہ مغربی نیشنل ازم کا اختیار کرنا خاص مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اور بھی ضروری ہے کیوں کہ اس کے بعد ہندوستان کے تہذیبی تعصبات مٹ جائیں گے اور دونوں ایک دوسرے سے دست وگریباں نہیں ہوں گے ورنہ اگر ایسا نہیں ہوا تو آزادی کے بعد دونوں فرقوں میں تہذیبی جنگ شروع ہو جائے گی اور چونکہ مسلمان اقلیت میں ہیں اس لیے ان کو شکست ماننی پڑے گی۔ ہندو کہیں گے کہ مسلمانوں کو ہندو تہذیب اور کلچر اختیار کرنا چاہیے اسی وقت وہ صحیح معنی میں ہندوستانی ہو سکتے ہیں، مسلمان کچھ اس کی مخالفت کریں گے لیکن آخر انھیں شکست ہوگی اور پھر وہ ہندو کلچر اور تہذیب کو اختیار کر کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جائیں گے، اس سے ان کی خودداری فنا ہو جائے گی، اس لیے دھوتی اور

پاجامہ، چپل اور جوتا، کرتا اور شیروانی کے نزاع کو حل کرنے کی بہتر صورت یہی ہے کہ دونوں ہی کو خیر باد کہہ دیا جائے اور ترکی کی طرح اپنا قومی لباس بھی مغربی لباس بنالیا جائے ، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو اور مسلمان معاشرت اور لباس کے اعتبار سے ایک ہوں گے اور ان کو یہ خیال نہیں ستائے گا کہ ہندوؤں نے تہذیبی اعتبار سے مسلمانوں کو فتح کرلیا اور اس پر اپنے کلچر کی گرفت کو سخت کردی ہے۔[٦]

مولانا سندھی کا یہ مقصد بھی نہیں تھا کہ یورپین کلچر کو بالکل اسی شکل میں اختیار کرلیا جائے جیسا کہ وہ یورپ میں ہے بلکہ مولانا چاہتے تھے کہ اس میں اسلامی اصول و آداب معاشرت کے مطابق تبدیلی کے بعد اختیار کیا جائے، اس مقام پر اس معاملے میں مولانا سندھی مرحوم سے ہمارا اختلاف ختم ہوجاتا ہے، اس سلسلۂ بحث میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی لکھتے ہیں:

''مولانا کا خیال تھا کہ مسلمان اسلامی آداب معاشرت کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے مغربی کلچر کو بہ آسانی کسی قدر تراش وخراش کے ساتھ اختیار کرسکتے ہیں۔''[٧]

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ پینٹ اور ہیٹ کا، دھوتی اور پاجامے کا تعلق کسی خاص شریعت سے ہے نہ مذہب سے ہے، اس طرح نہ کسی خاص قسم کی ٹوپی اور خاص وضع کی پگڑی کا تعلق کسی خاص مذہبی اور قومی شعار سے ہے اور اب تو پاجامہ، شیروانی اور ٹوپی ہندوستان کا قومی لباس ہے۔ دھوتی اور واسکٹ جسے صدری، واسکٹ یا اکثر جوار کٹ کہا جاتا ہے، قومی اور سرکاری تقریبات میں استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ دیہات میں کسانوں، مزدوروں وغیرہ کا بلاتفریق مذہب وملت ایک ہی لباس ہے، کاموں کی نوعیت، موسم اور استعمال کی سہولت کے پیش نظر ہندو مسلمان سب ایک ہی لباس پہنتے ہیں۔ حالات اور وقت کے تقاضوں نے اس مسئلے کو مذہب اور تہذیب کے نقطۂ نظر سے بحث کے لیے چھوڑا ہی کہاں ہے اور اب تو یہ بات بھی شک وشبہ سے بالا نہیں کہ ڈاڑھی یا اس کا کوئی خاص اسٹائل کسی خاص مذہب کا شعار ہے اور اگر یہ شعار ہے تو انسانی اور خاص مردوں کا۔ انسانی فطرت کے عین مطابق!

اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کر دینا چاہیے کہ مولانا سندھی یورپ کے جس قطع لباس کے اختیار واستعمال کے داعی ہیں وہ وہاں کے فارموں اور ملوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے کسانوں اور مزدوروں کا لباس ہے، نہ کہ یورپ کے کسی خاص مذہب یا فرقے کا روایتی اور امتیازی لباس ہے۔ ڈھیلا ڈھالا اور لمبا چوڑا الباس تو علمی، تحقیقی، تصنیف وتالیف کا اور دفتروں میں ٹیبل اور کرسی پر کام کرنے والوں کے لیے بھی موزوں نہیں ہو سکتا!

اسلام اور قومیت

قیام پاکستان سے قبل ایک اہم مسئلہ اسلام اور ہندوستانیت کی تطبیق کا تھا۔ عام مسلمانوں اور مسلم لیگ کے رہ نماؤں حتی کہ مولانا محمد علی جوہر کو بھی ان دونوں انتہاؤں میں اعتدال کی راہ نظر نہیں آتی تھی، ان کے نزدیک اسلام کو کسی خاص دائرے اور قومی حدود میں لانا اس کے تقدس اور ہمہ گیری کے خلاف تھا اور قومیت کی اسلام کے دائرے میں گنجائش نہ نکل سکتی تھی، پاکستان کی تحریک میں جذباتی سطح پر ایک اہم عصر اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ پاکستان کو اس کا حل اور مداوا سمجھا گیا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جوں ہی جذبات کی گہر دور ہوئی، فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ مسئلہ جوں کا توں بلکہ کچھ زیادہ شدت کے ساتھ موجود ہے۔ پہلے مسئلہ اسلام اور ہندوستانیت (یا ہندی قومیت) میں تطبیق کا تھا، اب وہ پریشان ہیں کہ سندھی، پنجابی، بلوچی، پختون قومیتوں کو اسلام کے دائرے میں کیوں کر لایا جائے؟

پریشانی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو مسلم قومیت کے اعلیٰ تصور میں انھیں وطنی قومیت کے لیے گنجائش نظر نہیں آتی، دوسری طرف صرف اسلام کے سوا زبان، تہذیب، ثقافت، معاشرت میں ایک دوسرے سے جو اختلافات ہیں ان کا انکار ممکن نہیں۔ ایک طرف تو وہ ان دلائل کو چھوڑنے اور فکر و نظر کے اس سرمایہ سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں جس نے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے اتحاد اور تحریک پاکستان کے بیڑے کو منجدھار سے نکالنے کا کام لیا تھا، دوسری طرف اپنے ہی ملک کی مختلف لسانی، تہذیبی اکائیوں کو اور ان قدرتی امتیازات کو جو زبان، نسل، ماحول، سماجی تہذیبی روایات نے پیدا کر دیے ہیں، نظر انداز کر دینے اور ان کے وجود سے انکار کر دینے کا ان حضرات کے پاس جواز

ہے اور نہ اس کا کوئی حل ہے۔ ان کے ذہن واماندہ اور عقلیں حیران ہیں، وہ اس کڑوے گھونٹ کو نہ حلق سے نیچے اتار سکتے ہیں اور نہ تھوک دینے کی ہمت ہے۔

مولانا سندھی مرحوم کے ذہن میں اس مسئلے میں کوئی الجھن نظر نہیں آتی۔ وہ انسان کی کسی علاقے سے وابستگی اور اس کے اعلان واظہار کو اسلامیت یا اسلامی قومیت کے اعلیٰ تصور کے خلاف نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک اعلیٰ اسلامی فکر اور قومیت میں وہی تعلق ہے جو دماغ اور جسم میں ہوتا ہے۔ دماغ کی ترقی کے لیے جسم کا انکار لازم نہیں آتا۔ سرور صاحب لکھتے ہیں:

> ''ایک بار جامعہ ملیہ اسلامیہ ہی میں قومیت، وطنیت اور کسی علاقے یا سرزمین سے ایک آدمی کے تعلق رکھنے اور وہاں کے ہونے کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں، مولانا فرمانے لگے کہ دیکھو ایک میرا دماغ ہے، دوسرا میرا جسم ہے، اگر میرے دماغ کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ میں اپنے جسم کا انکار کروں تو ایسی ترقی مجھے قبول نہیں، یہ ترقی میری ذات کی نفی ہے، میں سندھی یا پنجابی ہوں اور یہاں دہلی میں کام کرنا چاہتا ہوں، اگر اس کام کے لیے مجھے اپنے سندھی یا پنجابی ہونے کا انکار کرنا پڑے تو میں اس کام کو اپنی ذات کی ہلاکت سمجھوں گا، ہر حال میں میرے وجود کا اثبات ضروری ہے۔[۵]

ہندوستانی قومیت

مولانا سندھی مرحوم کے افکار کے سلسلے میں قومیت کی بحث نہایت اہم بحث ہے، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم کے خیال کی تھوڑی سی مزید وضاحت کر دی جائے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی لکھتے ہیں:

> ''اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قومیت سے ہماری مراد وہ نیشنلزم نہیں ہے جس کی وجہ سے قومی عصبیت کا نشوونما ہوتا ہے اور ایک قوم اپنے مقابلے میں دوسری قوموں کو حقیر و ذلیل سمجھتی ہے۔ کوئی شبہ

نہیں ہے کہ اس معنی کے اعتبار سے اسلام قومیت کا شدید دشمن ہے اور خود مولانا سندھی بھی اس نیشنل ازم کے قائل نہیں ہیں، جیسا کہ موصوف کے ان ارشادات سے واضح ہوتا ہے جو وحدت انسانیت کے زیرِ عنوان نقل ہوئے ہیں۔‘‘[۹]

اس کے بعد بتایا ہے کہ قومیت دراصل ہے کیا؟ لکھتے ہیں:

’’قومیت سے مراد وہ عادات وخصائل ہیں جو کسی ایک جماعت کا شعار بن گئے ہوں اور ان کی وجہ سے وہ جماعت دوسری جماعتوں یا قوموں کے مقابلے میں ممتاز سمجھی جاتی ہو۔ دوسرے لفظوں میں قومیت کو قومی مزاج سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ مولانا سندھی کا دعوی ہے اور بالکل بجا ہے کہ اسلام قومی مزاج کا لحاظ رکھتا ہے۔‘‘[۱۰]

مولانا سندھی مرحوم کے افکار کا ماخذ چوں کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا فلسفہ ہے، اس لیے مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ نے حضرت شاہ صاحب کی کتابوں حجۃ اللہ البالغہ اور تفہیمات الٰہیہ کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ اسلام واقعی قومی مزاج کا لحاظ رکھتا ہے نہ کہ اسے رد کرتا ہے۔[۱۱] اس کے بعد ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ’’ہندوستانی قومیت‘‘ سے مولانا سندھی مرحوم کی کیا مراد تھی؟ مولانا اکبر آبادی لکھتے ہیں:

’’مولانا (سندھی) یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ جب تک ہندوستان کی یہ دونوں بڑی قومیں کسی ایک محاذ پر جمع نہیں ہوں گی، ان کے سیاسی اور وطنی مسائل کی گتھی سلجھ نہیں سکے گی۔ اس مشترکہ محاذ کا نام مولانا ’’ہندوستانی قومیت‘‘ رکھتے ہیں۔ اس کا مفاد اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ہندو اور مسلمان باوجود اس ملک کی الگ الگ دو قوموں میں منقسم ہونے کے بہر حال ایک وطنی اشتراک رکھتے ہیں اور اس اشتراک کی بنا پر اس ملک اور وطن کا جو مطالبہ ہندوؤں سے ہے وہی مسلمانوں سے بھی ہے اور انھیں اس مطالبے کا جواب دینا چاہیے۔‘‘[۱۲]

لیکن مولانا اس مقصد کے لیے ہندوستانی قومیت کا ایسا معجون مرکب تیار کرنا نہیں چاہتے، جس میں مسلمانوں کے اسلامی خصائص و خصائل اور ملی امتیازات ختم ہو جائیں، بلکہ ان کا منشا یہ ہے (مولانا کے الفاظ ہیں):

> ”ہندو اور مسلمان دونوں مل کر کام کریں اور ان کی صرف ایک سیاسی تنظیم ہو، لیکن اس سیاسی تنظیم میں کسی مذہبی گروہ کا غلبہ نہ ہو۔“[۱۳]

ایک تاریخی حقیقت

اس بات کو سمجھنے کے لیے اس تاریخی حقیقت کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے:

جہاد آزادی ۱۸۵۷ء میں ناکامی کے بعد ولی اللٰہی فکری تحریک دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک گروہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی سربراہی میں منظم ہوا۔ اس نے دار العلوم دیو بند قائم کیا۔ دوسرا گروہ سر سید احمد خاں کی قیادت میں منظم ہوا، یہ علی گڑھ پارٹی کہلائی، اس نے علی گڑھ میں مدرسہ قائم کیا۔ علی گڑھ پارٹی نے برٹش استعمار سے تعاون کیا اور اس طرح اس نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ دیو بندی پارٹی نے عدم استعداد کے باوجود انگریزوں سے تعاون نہیں کیا، اس نے فکر کی پستی کو قبول نہ کیا۔ البتہ اپنا دائرۂ کار انقلابی و عملی سیاست کے بجائے حالات و مصالح کے مطابق انقلابی سیاسی فکر کی حفاظت اور علمی بنیادوں پر تحریک کی توسیع تک محدود رکھا۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی وفات کے بعد تحریک کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں تحریک کی قیادت کی باگ ڈور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندیؒ کے ہاتھ میں تھی۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ایک انقلابی قدم اٹھایا اور علی گڑھ پارٹی کے انقلابی نوجوانوں مثلاً مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ ۱۹۱۳ء میں جب مولانا سندھی نے اپنے انقلابی تعلیمی مرکز کو نظارت المعارف القرآنیہ کے نام سے دہلی میں قائم کیا تو اس کے سرپرستوں میں نواب وقار الملک کو شامل کر کے دیو بند اور علی گڑھ پارٹی کے تعلقات کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ اس وقت تک ہندوؤں سے ملنے اور ان کے تعاون سے ہندوستان کو آزاد کرانے کا رجحان پیدا نہیں ہوا تھا۔ جنگ عظیم کے خاتمے اور ترکی کے حصے بخرے ہونے تک حضرت شیخ الہند اسی پالیسی پر عمل پیرا رہے، ان کا خیال تھا کہ

ہندوؤں کو نظر انداز کر کے ہندوستان میں صرف مسلمانوں کو متحد کیا جائے اور بیرونی اسلامی ممالک ترکی، افغانستان وغیرہ کی مدد سے ہندوستان آزاد کرا لیا جائے لیکن ترکی کی شکست کے بعد انھیں اپنے اس مسلک پر نظر ثانی کرنی پڑی اور بعد میں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ جب تک ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں ملک کی اکثریت ہندوؤں کو ساتھ نہیں لیا جائے گا اس وقت تک آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں:

> ''مولانا شیخ الہند کی یہ کوششیں جاری تھیں کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوگئی اور انگریزوں کی طرف سے دولتِ عثمانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا گیا۔ طبعاً شیخ الہند کی جماعت نے انگریزوں کے خلاف ترکوں کی مدد کی اور اس سلسلے میں ان کو اور ان کی جماعت کو سخت مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ دولتِ عثمانیہ کی شکست کے بعد ولی اللّٰہی تحریک کا یہ رجحان کہ عالم اسلامی کی مدد کر کے یا ان کی مدد لے کر ہندوستان میں مسلمانوں کے قومی وجود کو تقویت دی جائے، نا قابلِ عمل ہو گیا، چنانچہ اس جماعت کو مجبوراً اپنا مسلک بدلنا پڑا اور اس کو اس میں مصلحت نظر آئی کہ اب جب کہ کوئی بین الاقوامی اسلامی مرکز نہیں رہا، ہندوستان کی آزادی کے لیے غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ تعاون کیا جائے اور ان کے ساتھ مل کر ملک کو آزاد کرانے کی جدو جہد ہو، اس خیال کے ماتحت مولانا محمود حسنؒ نے اپنی جماعت کو کانگریس میں شرکت کی اجازت دی، یہ ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے اور یہاں سے اسلامی ہند کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔''[۱۴]

مولانا سندھی مرحوم کی ہندوستانی قومیت صرف یہ ہے کہ ملک کی آزادی اور تعمیر و ترقی کے لیے تمام اہل ملک متحدہ طور پر کوشش کریں اور آزادی کے بعد ملک کے اندر مشترکہ مفاد کے لیے کام کریں۔ اس کا انھیں ۱۹۱۶ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے کابل میں مشورہ دیا تھا۔[۱۵] اور یہ وہی حقیقت ثابتہ ہے جس کی طرف بانی پاکستان نے قیام پاکستان کے وقت سب سے پہلے توجہ فرمائی اور اس غلط فہمی کو دور کر دیا کہ پاکستان میں دو یا کئی قومیں بستی ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو دوسری پر قانون کی نظر میں

برتری حاصل ہے، انھوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ پاکستان میں صرف ایک قوم بستی ہے اور وہ ہے پاکستانی قوم۔[۱۶]

بانی پاکستان کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ ہندو اپنے مذہبی اور تہذیبی خصائص چھوڑ کر مسلمانوں میں ضم ہو جائیں، بلکہ صرف یہ مقصد تھا کہ ملک کے قانون کی نظر میں ہندو مسلمان یا مسلمان اور کسی دوسری قوم میں کوئی تفریق نہ ہوگی اور محض اکثریت میں ہونے کی وجہ سے مسلمان قانون کی نظر میں قابلِ رعایت نہ ہوں گے۔

اگر انصاف سے اور سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر سے کام لیا جائے تو اس نتیجے تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی کہ اس حقیقت پسندانہ تصور نے ملک کو آزادی کی منزل سے قریب کر دیا۔ ورنہ اگر علی گڑھ پارٹی کی قیادت پر انحصار کیا جاتا تو نہ صرف ہندوستان پاکستان میں بلکہ ایشیا و افریقہ کے ممالک سے برٹش استعمار کے جبر و تسلط کا طلسم کبھی نہ ٹوٹتا۔ ملک میں آزادی کا سورج کم از ابھی تک تو ہرگز طلوع نہ ہوا ہوتا اور مسلمان ابھی تک جداگانہ حقوق اور ان کے تحفظ کی سطح سے بلند نہ ہوئے ہوتے۔ آج بھی ہم اس حقیقت پسندانہ تصور کو اپنائے بغیر ملکی تعمیر و ترقی کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے۔

شخصیات

کتاب (عبید اللہ سندھی: حالاتِ زندگی، تعلیمات و سیاسی افکار) کا آخری باب شخصیات کے بارے میں مولانا سندھی مرحوم کے افادات و ملفوظات پر مشتمل ہے، اس میں مستقلاً تو حضرت مجدد الف ثانی سے لے کر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم تک کل نو شخصیتوں کا تذکرہ ہے لیکن ضمناً اس باب میں اور کتاب کے دوسرے ابواب میں پچاسوں شخصیتوں کا تذکرہ آیا ہے اور بعض شخصیتوں مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ تو اس تفصیل کے ساتھ آیا ہے کہ اگر اسے ایک جگہ کر دیا جاتا تو مستقل طور پر زیر بحث کسی شخصیت سے کم نہ ہوتا اور ان شخصیتوں میں مسلم اور غیر مسلم ہر طرح کی شخصیتیں ہیں، جہاں حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت سید احمد شہید بریلوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، سرسید احمد خان، مولانا محمد علی، علامہ اقبال وغیرہ ہیں وہیں پنڈت جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی اور بعض قادیانی اکابر بھی ہیں۔ شخصیات کے بارے میں ان کا مطالعہ بالکل بے لاگ ہے، اس معاملے میں انھوں نے کوئی لگی لپٹی نہیں

رکھی ہے، جہاں خوبیوں کا اعتراف ہے انھوں نے گاندھی جی، پنڈت نہرو اور حکیم نورالدین بھیروی کی خوبیوں کا اعتراف بھی بلا خوف لومتہ لائم کیا ہے، اور جہاں تک تنقید کا تعلق ہے انھوں نے نہ تو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو بخشا ہے اور نہ علامہ اقبال کو معاف کیا ہے، علامہ اقبال مرحوم کا تذکرہ پڑھتے ہوئے ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے، بلا شبہ ان کی زندگی، سیرت اور شاعری کا وہ پہلو واقعی ہے، جس کی طرف مولانا سندھی نے اشارہ کیا لیکن اسلام، حریت اور خودی کے ترجمان اقبال کے بارے میں ہمارے تصور پر اس سے زد پڑتی ہے، اسی طرح مولانا محمد علی جوہر سے ہماری عقیدت بھی مجروح ہوتی ہے۔ جب ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں دوسرے ہندو مسلمان رہنماؤں کے مقابلے میں مولانا محمد علی کے سیاسی اختلاف و تنقید کی سطح جذبات اور ذاتی پسند ناپسند سے زیادہ بلند نہیں ہو سکی، انھوں نے دلائل کے بجائے منطق سے اور تدبر کے بجائے جوش و جذبات سے مسائل پر نظر ڈالی ہے۔

ہمارے نزدیک تو منطق اور جوش و جذبات کا بھی ایک مقام ہے اور اس لحاظ سے مولانا محمد علی سیاست میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں۔ لیکن مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی علمی و فکری شخصیت کی تعمیر دوسری قسم کی مٹی سے ہوئی ہے۔ وہ محض منطق اور صرف جذبات سے مطمئن نہیں ہوتے، بلکہ وہ ہر بات کے لیے ایک طرف تو عقل و حکمت کی ٹھوس اور پختہ بنیاد تلاش کرتے ہیں، دوسری طرف ان کی نظر ہر بات کے عملی نتائج پر مرکوز رہتی ہے۔

اسی طرح محمد علی جناح کے بارے میں بھی بعض باتیں آتی ہیں لیکن یہ مسائل و افکار کا فلسفیانہ تجزیہ اور تاریخ ہے اور اس منزل سے ہم جب بھی گزریں گے اور اس سے گزرے بغیر چارہ نہیں، تو یہ ناگوار فرض بھی ہمیں انجام دینا ہی پڑے گا، ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مولانا سندھی جناح صاحب کے معاصر اور تحریک آزادی اور انقلابی سیاسیات میں ان سے آگے تھے۔ ملک کی آزادی اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے انھوں نے بیش بہا قربانیاں دی تھیں اور اپنے آپ کو خطرات میں ڈالا تھا، اُن کے مقابلے میں ہم جناح صاحب سے ارادات کا رشتہ اور مقلدانہ تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان کے بارے میں ہمارا اور مولانا سندھی کا نقطۂ نظر، انداز بیان اور لب و لہجہ یکساں نہیں ہو سکتا۔

ضمنی طور پر ایک جگہ غلام احمد پرویز کا ذکر بھی آ گیا ہے، پرویز صاحب انگریزی حکومت سے کمال درجہ وفاداری اور اطاعت شعاری کے ساتھ جس ذوق و ولولہ سے تحریک پاکستان میں شریک

ہوئے وہ ان کی عظمت کے لیے کافی ہے، ان کی شخصیت اور افکار میں مطالعے کا کچھ کم سروسامان نہیں، لیکن یہاں صرف مولانا سندھی کے افکار پیش نظر ہیں، واضح رہے کہ سرور صاحب نے ان کے نام کے اظہار سے زبان وقلم کو آلودہ نہیں کیا۔ پرویز صاحب ایسی شخصیت نہیں کہ ان کے بارے میں فاضل مؤلف یہ رویہ اختیار کریں، بہرحال قلم سرور صاحب کے ہاتھ میں تھا اور اس بات کا فیصلہ انھیں کو کرنا تھا کہ ان کا نام لیا جائے یا صفحہ کتاب کو اس آلودگی سے بچایا جائے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں:

''ایک صاحب جو برسوں سے قرآن مجید کا درس دے رہے تھے اور انھوں نے قرآن مجید پر بڑی بڑی کتابیں بھی لکھی ہیں، اس سلسلے میں انھوں نے سالہا سال تک قرآن اور اسلام کے نام سے مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف بڑی بڑی مہمیں چلائیں اور جب مولانا سندھی واپس وطن آئے تو ان کی مخالفت میں بھی جی بھر کر لکھا۔ ایک دفعہ ان صاحب کی مولانا سے جامعہ نگر میں ملاقات ہوگئی اور آپس میں باتیں ہونے لگیں، موصوف بات بات پر قرآن کی کسی آیت کا حوالہ دیتے، مولانا نے انھیں کہا کہ اپنی بات کیجیے اور قرآن کے حوالے نہ دیجیے، وہ پھر کسی آیت کا حوالہ دے دیتے، اس پر مولانا بگڑ گئے اور بڑے غصے میں کہنے لگے کہ تم ایسی غیر مؤثر کتاب کا حوالہ کیوں دیتے ہو کہ اسے تم برسوں سے پڑھ رہے ہو اور اس کا درس دے رہے ہوں، وہ تم سے انگریز کی نوکری تک نہیں چھڑا سکی۔ [۱۷]

قرآن حکیم کی موثر حیثیت کا اندازہ مولانا سندھی مرحوم کے بیان سے ہو جاتا ہے کیا۔ اس کے اثرات موصوف کی زندگی میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں؟ پرویز صاحب کے نزدیک قرآن کے تمام مضامین ابوالکلام اور کانگریس کی مخالفت، مسلم لیگ کی حمایت اور برٹش حکومت کی غیر مشروط وفاداری کے گرد گھومتے ہیں۔ ابوالکلام کی مخالفت بھی دراصل کانگریس کی مخالفت کی وجہ سے تھی۔ گویا کہ اصل نزاع کانگریس اور مسلم لیگ کا تھا اور کانگریس اور مسلم لیگ کی لڑائی بقول مولانا سندھی ایک لبرل لیڈر یعنی جناح صاحب کے انتقامی جذبے کا مظاہرہ ہے۔ [۱۸]

مولانا سندھی کی ظرافت

کتاب میں مرزا غلام احمد قادیانی، ان کی جماعت اور پنجاب میں اس کے فروغ واثرات کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ تجزیہ دلچسپ ہے۔ خصوصاً یہ بحث کہ مولوی حکیم نورالدین باوجودے کہ مرزا غلام احمد سے علم وفضل میں برتر تھے، لیکن وہ کیا نفسیاتی عوامل تھے جن کی وجہ سے وہ مرزا صاحب کے حلقہ بگوش ہونے پر مجبور ہو گئے یا اسی طرح بعض دیگر معتقدین جو خلیفہ قادیان کے کاردیگر سے واقفیت رکھنے کے باوجود ان کے اطاعت گزار تھے، اس کے اسباب کیا تھے؟

مولانا عبیداللہ سندھی ایک انقلابی اور خالص عملی انسان تھے۔ ان کے یہاں ادبی ذوق، حس لطیف اور ظرافت کا عنصر بہت کم نظر آتا ہے لیکن مرزا صاحب کے مضحکہ خیز دعوے پڑھ کر ان کی رگ ظرافت بھی بھڑک اٹھی۔ مرزا صاحب کی کتابوں کے مطالعے کے بعد انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

> ''میرا جوانی کا زمانہ تھا، دیوبند سے فارغ ہو کر سندھ میں اپنے بزرگوں کے ساتھ رہتا تھا اور کچھ روحانی ریاضتیں کر رہا تھا۔ مجھ تک مرزا غلام احمد اور ان کی دعوت کی خبریں پہنچیں، میں نے ان کی کتابیں منگوائیں اور انھیں پڑھ ڈالیں، انھیں پڑھ کر میرا تاثر یہ تھا:
>
> ۱۔ مجھ میں مرزا غلام احمد سے زیادہ نبی بننے کی صلاحیتیں ہیں۔
>
> ۲۔ میں نے اپنی ذات کے ساتھ عہد کیا کہ عوام میں کبھی تقدس کا جامہ پہن کر یا مقدس بن کر نہیں جاؤں گا۔ [۱۹]

ملک کی تقسیم

مولانا مرحوم چونکہ ایک انقلابی، مدبر اور مفکر تھے اور ملک کی آزادی کے لیے انھوں نے شدید مصائب اور غربت وجلاوطنی کی تکالیف اٹھائیں تھیں، اس لیے ملک کی آزادی، ہندو مسلم مسئلہ اور اس کا حل ان کے غور وفکر اور نظر وتدبر کا خاص موضوع رہا تھا، اس لیے افادات و ملفوظات کا

بیشتر حصہ سیاسی مسائل وافکار کے تجزیے میں ہے اور چونکہ یہ تجزیہ ایک ایسے ذہن ودماغ کا ہے جس نے من کل الوجوہ کسی جماعت کو بھی صحیح نہیں سمجھا تھا اور جس کا ذہن ودماغ کسی مخصوص جماعت کی سیاسی پالیسی اور مفاد ومصالح کا پابند نہ تھا اس لیے یہ تجزیہ بے لاگ بھی ہے اور چونکہ تاریخ نہیں تجزیہ ہے اس لیے اس سے ہر جگہ اتفاق کرنا مشکل ہوجاتا ہے، بعض مقامات پر ان کی رائے محل نظر ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص کا یہی نقطۂ نظر ہو اور ہر کوئی اس نتیجے تک پہنچے۔ اس سلسلے میں بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن میں یہاں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔

۱۹۴۱ء میں مدراس کے ایک مقام کمباکونم میں ایک کانفرنس کے خطبہ صدارت میں انھوں نے دو باتوں پر خاص زور دیا:

۱۔ مسلمانوں کو اسلام کے کسی قسم کے بین الاقوامی سیاسی اتحاد کا خیال دماغ سے نکال دینا چاہیے اور ہمیں سوائے اپنے وطن کے، دوسرے اسلامی ممالک کی طرف نہ دیکھنا چاہیے، ہمیں اپنے ملک کی قیادت پر، اپنے ملک کے وسائل پر اور اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کرنا چاہیے، عالم اسلامی کا اتحاد، اسلامی بلاک کا قیام وغیرہ نعرے اور تحریکیں درحقیقت ہماری انقلابیت اور خوداعتمادی کے لیے لوریوں اور تھپکیوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۲۔ دوسری بات جس کی طرف انھوں نے توجہ دلائی ہے یہ تھی کہ مسلمان جن خوش آئند آرزوؤں اور خواہشوں کے ساتھ ملک کی تقسیم کا مطالبہ کررہے ہیں ان کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں اور جیسا کہ اس وقت حالات تھے مولانا کا خیال بھی یہی تھا کہ ''یہ سب باتیں ہوائی ہیں۔''

ترتیب کتاب

افادات و ملفوظات کی ترتیب اس سے قطعی مختلف ہے جیسی کہ صوفیہ وغیرہ کے ملفوظات میں نظر آتی ہے، یعنی مضامین کے لحاظ سے دیکھیے تو غیر مرتب اور مطالب ومفاہیم پر نظر کیجیے تو مبہم، ملفوظات ذومعنی، جس کی کئی کئی تعبیریں کی جاسکتی ہیں، سرور صاحب نے یہ نہیں کیا کہ جو ملفوظات جس تاریخ کو مولانا کی زبان سے نکلے انھیں درج کردیا ہو، ابتدائی ابواب مولانا کے سوانح وافکار پر مشتمل ہیں، مثلاً ابتدائی تین ابواب یہ ہیں:

ا۔خدمت میں حاضری

سرور صاحب کی مکہ معظمہ میں مولانا سندھی کی خدمت میں حاضری اورابتدائی ملاقات اورحج اورمناسک حج میں ظاہر پرستی اور خدا سے دعاؤں کے لیے کسی خاص زبان کے لزوم کی بحث۔

۲۔مکہ معظمہ میں علمی وسیاسی دلچسپیاں

مکہ معظمہ میں مولانا سندھی کی زندگی علم ومطالعہ، درس وتدریس، تعلیم وتعلم کی مصروفتیں، فکرو تدبراوراہلِ علم اورشائقین سے ملاقاتیں۔

۳۔واپس وطن میں

ہندوستان میں مولانا کی آمد، مولانا کے بعض سیاسی خیالات اوراپنی تعلیم کے نصاب ونظام کے بارے میں مولانا کے خیالات اوران کی تنقیداوراس سے دینی حلقوں میں بے چینی کی روداد۔

۴۔جامعہ میں بیت الحکمت کا قیام

اس میں مولانا نے مسلمان نوجوانوں کی تعلیم وتربیت اورحضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مذہبی، سیاسی، معاشی نظریات پرتعلیم وتدریس اورتحقیق وتالیف اورنتائج مطالعہ ونظر کی اشاعت و ترویج کی ضرورت اوراس کی اہمیت پرروشنی ڈالی ہے۔

۵۔علمی وفکری مراکز،سیاسی اجتماعات میں شرکت

یہ باب مولانا کے ان سیاسی ومعاشی اور ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں کے افکارونظریات پر تنقید میں ہے۔اس میں سرور صاحب نے ان مختلف خطبات اوران کے مطالب پربھی بحث کی ہے، جو مولانا نے جمعیت علماء، کانگریس وغیرہ مختلف جماعتوں کے اجلاسوں میں پیش کیے تھے۔

آخری تین بابوں کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں:

۶۔سوشلزم اور مذہب

۷۔شخصیات

مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی، مولانا محمود حسن، سر سید احمد خاں، اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور حکیم نور الدین قادیانی۔

۸۔ملفوظات

اس عنوان کے تحت قرآن، احادیث، فقہ، فرعون کی نجات، تناسخ، اسلام، انقلاب، تہذیب، عورتیں اور پردہ، دار العلوم دیو بند، علی گڑھ کالج، دین اور سیاسی غلبہ، اشراف پرستی وغیرہ بیسیوں موضوعات پر مولانا سندھی مرحوم کے ملفوظات ہیں۔

لیکن سرور صاحب نے صرف ملفوظات پیش کر دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی تشریح و تفہیم کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش بھی کی ہے اور وہ اس میں ناکام نہیں ہیں۔ انھوں نے مولانا سندھی کے ملفوظات کی ترتیب و تہذیب کا فریضہ بھی انجام دیا ہے اور مولانا کی دوسری تحریروں سے اور خانوادہ ولی اللّٰہی کے اکابر کی تحریروں کے حوالوں سے ان کی تشریح و وضاحت کر کے بہت سے اشکال کو بھی رفع کر دیا ہے اور مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے بیان کے الجھاؤ کو دور کر دیا ہے۔

مولانا سندھی پر سرور صاحب کی انھیں دونوں کتابوں پر مشہور صحافی میاں محمد شفیع اور مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین کے اقوال جو مولانا عبید اللہ انور نے اپنے مضمون میں نقل کیے ہیں، قابلِ غور ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''ایسے ہی مولانا سندھی پر افادات و ملفوظات اور مولانا عبید اللہ سندھی نام کی دو کتابیں لکھ کر تو انھوں نے امت پر احسان عظیم کیا ہے۔ انھی دنوں نوائے وقت کے مشہور کالم نویس میاں محمد شفیع صاحب نے صحیح لکھا کہ سرور صاحب نے مولانا کے خیالات کو آج کے قومی اور عالمی حالات کے پس منظر میں شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اگر یہ کتاب

انگریزی میں لکھی جاتی تو آج سارے عالم اسلام میں اس کی دھوم مچ گئی ہوتی۔۱۹۴۳ء میں جب یہ کتاب چھپی تو ذاکر صاحب نے اسے پڑھ کر فرمایا سرسید کی لائف حیات جاوید میں نے کئی بار پڑھی ہے لیکن یہ کتاب پڑھنے کے بعد اب وہ مجھے ایک مرثیہ محسوس ہوتی ہے۔اس کتاب میں روشنی، پیغام، امید اور زندگی کی امنگ دکھائی دیتی ہے۔اس کا منظر عام پر آنا تھا کہ پورے ہندوستان میں ایک تہلکہ مچ گیا۔''[۲۰]

اس مضمون میں اسی کتاب کے حوالے سے مولانا عبید اللہ انور لکھتے ہیں:

''جماعت اسلامی نے تو آسمان سر پر اٹھالیا۔میرے سامنے ملک نصر اللہ خان عزیز نے مولانا سندھی سے پوچھا اس کتاب کے بارے میں خود آپ کی کیا رائے ہے، مولانا نے فرمایا: پروفیسر صاحب نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ میرے افکار و خیالات سے متصادم کوئی چیز اس میں نہ آنے پائے، ظاہر ہے خیالات تو میرے ہی ہیں لیکن زبان و بیان سرور صاحب کا ہے۔''

''اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دور میں اس کتاب نے دوست دشمن پر گہرے اثرات چھوڑے اور طلبا برادری کو تو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔اس کے مطالعے سے طلبا اپنے دل میں شوق اور تحقیق و تجس کے سوتے پھوٹتے ہوئے محسوس کرتے اور کائنات کے جدید علوم سے دامن بھرنے اور نئے افق سر کرنے کی اپنے اندر لگن پاتے۔اس کے برعکس کچھ لوگ اس کے بعض مندرجات سے پریشان ہو گئے۔''

اسی سلسلے میں مضمون نگار نے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا یہ حوالہ دیا ہے:

''اس ملی جلی فضا میں ایک روز دیو بند کی جامع مسجد میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی تقریر کرتے ہوئے فرمانے لگے، کاش یہ کتاب میں نے یا مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مرتب کی ہوتی تو گرد و غبار کی یہ آندھی کبھی نہ اٹھتی، افسوس کے لہجے میں فرمایا ہماری سستی اور اغیار کی چستی نے ہمیں یہ دن

دکھایا ہے، اس سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے۔''[۲۱]

مولانا سیوہاروی کا گردوغبار کی آندھی سے اشارہ جماعت اسلامی کے مسعود عالم ندوی کی غوغا آرائی کی طرف ہے۔

کسی مفکر یا مصنف کے تمام خیالات سے اتفاق تو بہت مشکل ہے اور نہ ہر بات بے چون و چرا تسلیم کی جا سکتی ہے۔ اگر ایسی کوئی چیز ہے تو وہ صرف قرآن حکیم اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ہے جس کے آگے ایک مسلمان بے سوچے سمجھے بھی سر طاعت وتسلیم جھکا سکتا ہے۔ اگر چہ قرآن حکیم کا یہ مقصد نہیں ہے کہ کسی سچائی اور حقیقت کو بھی بے سوچے سمجھے اختیار کر لیا جائے، حال آنکہ حق آپ کے تفکر وتدبر تو کجا اختیار وتسلیم کا بھی محتاج نہیں۔ مولانا سندھی کے افکار کو مقلدانہ کیوں کر تسلیم کر لیا جا سکتا ہے۔ مولانا سندھی مرحوم نے سوشل ازم کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ بلاشبہ مولانا کا نہایت مخلصانہ اور دیانت دارانہ مطالعہ ہے، لیکن کیا اس کی حقیقت صرف وہی ہے، جو مولانا سندھی مرحوم کو نظر آئی ہے؟ یہ بات محل نظر ہے، مولانا نے سوشل ازم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے میرے نزدیک وہ ان کا اپنا نقطۂ نظر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا نقطۂ نظر نہایت اہم ہے اور اسے یوں ہی نظر انداز نہیں کر دیا جا سکتا، نہ بہ یک قلم اسے رد کر دیا جا سکتا ہے۔ معلوم ہے کہ مولانا نے اس پر ایک معاشی نظام کی حیثیت سے نظر ڈالی ہے اور ایک ایسا معاشی نظام جس کے فلسفے کی بنیاد عوام کی بہبودی اور انسانیت کی فلاح پر ہو یہ کیوں کر سمجھ لیا جا سکتا ہے کہ اسلام اس کا مخالف ہوگا اور اسلام میں انسانیت کی خدمت اور اس کی فلاح و بہبود کے اس ذریعے کی کوئی گنجایش نہ ہوگی؟

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی شخصیت کے اس پہلو کو ہرگز نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے کہ ان کے تمام افکار کی بنیاد حضرت شاہ ولی اللہ کے دینی اور عمرانی نظریات پر ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ کے علوم ومعارف پر مولانا کی نظر کا جو عالم ہے وہ معلوم ومسلم ہے۔ اہلِ علم نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب، مولانا سندھی مرحوم کے ایک مقالے ''امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف'' [مطبوعہ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر] (جو بعد میں کتابی شکل میں چھپا شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ نامی کتاب دراصل مولانا سندھی مرحوم کا ہی مقالہ ہے) کے مطالعے کے بعد لکھتے ہیں:

''اس کے مطالعے کے بعد ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے ولی اللٰہی حکمت پر مولانا (سندھیؒ) کی نظر کس قدر گہری ہے اور شاہ صاحب کے علوم و معارف کا انھوں نے کس قدر عمیق مطالعہ فرمایا ہے۔''[۲۲]

مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مولانا سندھی کے مضمون کو میں نے بغور پڑھا اور اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ بیشک مولانا کی نظر حضرت شاہ صاحب کے فلسفے اور نظریات پر نہایت وسیع اور عمیق ہے۔''[۲۳]

مولانا نعمانی اور حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ کے ارشادات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا سندھی کے جن افادات وملفوظات کی بنیاد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے علوم ومعارف پر ہوگی، ان کی علمی اور دینی قدر و قیمت کیا ہوگی؟

سرور صاحب پر میں ایک بزرگ کا یہ الزام سن چکا تھا کہ انھوں نے اپنے خیالات کے لیے مولانا سندھی کو آڑ بنایا ہے، میرے نزدیک اس الزام کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس لیے کہ اس الزام کی بنیاد جس کتاب پر ہے یعنی مولانا عبید اللہ سندھی، حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار وہ مولانا مرحوم کی زندگی میں چھپ چکی تھی اور نہ صرف یہ کہ کوئی ایسی شہادت موجود نہیں جس سے مولانا سندھی کے عدم اطمینان اور شکایت کا پتا چلے، حقیقت یہ ہے کہ وہ کتاب شائع ہونے کے بعد مولانا کی نظر سے گزری اور انھوں نے اسے پسند فرمایا تھا۔ دوسری بات جس سے اس الزام کی نفی ہو جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ مولانا نے خود اپنی تحریروں، خطبوں وغیرہ میں اور انھیں موضوعات پر مجملاً یا مفصلاً جو کچھ لکھا ہے وہ اس سے متبائن نہیں، جو بات مولانا اپنے خطبات ومقالات میں موقع ومحل کی مناسبت سے خود لکھتے ہیں، وہی بات صرف اندازِ بیان کے تفاوت سے سرور صاحب نے لکھی ہے۔

اگرچہ مجھے اپنی اس رائے کی صحت میں قطعاً شبہہ نہ تھا پھر بھی میرے ذہن میں چونکہ ایک خلش تھی اس لیے میرے ذہنی سکون اور اطمینان قلب کے لیے یہ استدلال کافی نہیں ہے۔ اس لیے میں نے سرور صاحب کی دوسری تصنیفات اور مرتبات کے مقدمے دیکھے جن میں سرور صاحب نے انھیں

مسائل ومباحث کے بارے میں اپنا مطالعہ وتجزیہ پیش کیا تھا۔ مثلاً مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، جماعت اسلامی وغیرہ اور سرسری نظر سے مولانا سندھی کے افادات و ملفوظات اور سرور صاحب کے نتائج مطالعہ ونظر کے اختلافات واضح ہو گئے اور صاف معلوم ہو گیا کہ بعض افراد، جماعتوں اور مسائل کے بارے میں سرور صاحب کا نقطۂ نظر اور نتیجۂ فکر مولانا سندھی کے مطالعے اور تجزیے سے مختلف ہے۔ ایک بنیادی فرق تو یہی ہے کہ مولانا سندھی کا دورِ حیات وہ تھا جس میں ہندوستان میں یہ مسئلہ زیرِ بحث تھا کہ برصغیر پاک وہند کے سیاسی مسئلے کا حل کیا ہو؟ سرور صاحب کا سیاسی گردوپیش اس سے قطعی مختلف ہے۔

مولانا سندھی پر دوسری کتابیں

ا۔ افادات وملفوظات

اس وقت تک سرور صاحب کی یہ آخری کتاب ضرور ہے لیکن پہلی نہیں ہے۔ گزشتہ چوالیس برس سے مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم ان کا علمی موضوع ہیں۔ انھوں نے مولانا کی متعدد کتابیں مرتب بھی کیں، ان پر بہت کچھ لکھا اور پھر ان کی اشاعت کا سروسامان بھی کیا۔ اس طرح اردو میں ان کی تالیفات مولانا سندھی کی شخصیت، خدمات اور افکار کے بارے میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ جہاں تک مولانا سندھی کے تعارف کا تعلق ہے کسی ایک شخص کو اس کا کریڈٹ نہیں دیا جا سکتا۔ بلاشبہ اس میں دوسروں کا حصہ بھی ہے لیکن سرور صاحب کی خدمت سب سے زیادہ ہے۔

۲۔ مولانا عبیداللہ سندھی حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار

مولانا سندھی مرحوم پر سرور صاحب کی یہ پہلی کتاب تھی۔ ۱۹۶۷ء تک اس کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ یہ پہلی کتاب ہے جس نے مولانا سندھی مرحوم کے سوانح وافکار کے بارے میں مستند معلومات فراہم کیں۔ اس کی شہرت اور مقبولیت اردو کے حلقوں میں کم نہیں۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس وقت مولانا سندھی مرحوم حیات تھے۔ انھوں نے اسے دیکھا تھا اور اسے پسند فرمایا۔ اس مضمون میں متعدد مقامات پر اس کا تذکرہ اور حوالے گزر چکے ہیں۔ یہ کتاب چونکہ ضخیم

(۴۶۴صفحات) تھی۔اس لیے سرور صاحب نے مولانا سندھی کے حالات وافکار کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کے لیے اس کا ایک خلاصہ تعلیمات مولانا عبیداللہ سندھی کے نام سے چھاپ دیا، وہ بھی کئی بار چھپ چکا ہے۔

۳۔مولانا عبیداللہ سندھی اوران کے ناقد

سرور صاحب کی پہلی کتاب شائع ہوئی تو جماعت اسلامی کے مسعود عالم ندوی کے قلم سے اس پر انتہائی غضب آلود، اشتعال انگیز، ہیجان پرور اور دل آزار تبصرہ آیا۔ مرحوم کا یہ تبصرہ معارف اعظم گڑھ، ستمبر۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔اس شمارے میں مولانا سندھی مرحوم کی تعزیت میں ایڈیٹر معارف علامہ سید سلیمان ندوی کے قلم سے دوسطریں تھیں۔مولانا سندھی مرحوم سے تعلق ارادت رکھنے والوں کو مولانا مسعود عالم ندوی اور حضرت سید صاحب کے اس رویے سے شدید تکلیف پہنچی۔

اس تنقید سے متاثر ہوکر مولانا سندھی کے ایک عاشق عالم دین مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایڈیٹر برھان [دہلی] نے قلم اُٹھایا اور نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ تنقید نگار کی غلط فہمیوں کی تردید کی۔ یہ سلسلہ مضمون اکتوبر۱۹۴۴ء سے شروع ہوکر ۱۹۴۵ء کے اوائل تک جاری رہا۔ سرور صاحب نے اس سلسلہ مضمون کو کتابی شکل میں مرتب کردیا۔اس پر ایک پیش لفظ تحریر فرمایا اور کمال دیانت سے کام لے کر کتاب کے آخر میں زیرِ بحث تنقید بھی شامل کردی تا کہ قارئین تنقید اور اس کا جواب پڑھ کر مولانا سندھی کے ناقدین کی علمی دیانت اور قلم کی متانت کا اندازہ کرسکیں۔ (۱)

---

(۱) یہ محض اتفاق تھا کہ مولانا سندھی پر یہ تنقید اور تعزیت ایک ہی شمارے میں آئی۔ظاہر ہے کہ تنقید پہلے آئی ہوگی۔اس کی کتابت وغیرہ ہوچکی ہوگی اور جب مولانا سندھی کے انتقال (۲۱راگست ۱۹۴۴ء) کی خبر پہنچی تو نظرات میں تعزیت کردی ہوگی۔لیکن یہ تعجب ہے کہ مولانا سندھی پر دوسطر میں جب کہ ان سے کم حیثیت کے لوگوں پر حضرت سید صاحب نے زبردست ماتم کیا ہے۔لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ذاتی تعلق خاطر کی بات ہوگی یا زیرِنظر شمارے میں اس سے زیادہ جگہ نہ نکل سکی ہوگی اور بعد میں اس کا موقع نہ رہا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سید صاحب ان خیالات سے متفق نہ ہوں لیکن اپنے عزیز و ہم وطن شاگرد کی دل داری کے خیالات سے یہ مضمون چھاپ دیا ہو۔

۴۔کابل میں سات سال

کابل میں سات سال کے عنوان سے مولانا سندھی کی سیاسی ڈائری اور خود نوشت حالات زندگی کو ایک کتابچے کی صورت میں ایک مدلل اور مفصل مقدمے کے ساتھ شامل کیا۔اس کے بھی کئی ایڈیشن مقبول ہو چکے ہیں۔

۵۔خطبات و مقالات

مولانا سندھی مرحوم کے پانچ خطبوں اور آٹھ مقالوں اور تحریروں کا یہ مجموعہ ہے۔ان پر بھی سرور صاحب نے ایک مفید اور جامع مقدمہ لکھا ہے جس سے مولانا کی ملی خدمات اور افکار کے مطالعے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

٦۔شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کا ایک نہایت محققانہ مقالہ الفرقان بریلی کے شاہ ولی اللہ نمبر میں امام ولی الله کی حکمت کا اجمالی تعارف کے نام سے چھپا تھا جسے اہلِ علم میں بہت پسند کیا گیا اور مولانا منظور نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے اس کی تحسین فرمائی اور علوم ولی اللّٰہی میں مولانا سندھی کے کمال تبحر اور نظر و بصیرت کا اعتراف کیا۔یہ مقالہ پہلے کتابی صورت میں مولانا محمد نور الحق علوی کے حواشی کے ساتھ شائع ہوا تھا لیکن اس اشاعت سے صرف اہلِ علم ہی استفادہ کر سکتے تھے۔اس مقالے کے مخاطب بھی عوام نہیں، خواص ہی تھے۔سرور صاحب نے اسے از سرِ نو مرتب کیا اور ایک محققانہ مقدمے اور مفید دیباچے کے ساتھ شاہ ولی الله اور ان کا فلسفہ کے نام سے شائع کیا۔اس وقت تک اس کے چار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

۷۔شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک

مولانا سندھی مرحوم کی ایک اور کتاب شاہ ولی الله اور ان کی سیاسی تحریک ہے جس پر مولانا محمد نور الحق علوی نے نہایت مفید اور محققانہ حواشی تحریر فرمائے تھے۔لیکن یہ

کتاب بھی عوام سے زیادہ خواص کے لیے تھی۔اس لیے عوام کے فہم کے لیے آسان بنانے کی غرض سے سرور صاحب نے اسے بھی از سرِ نو مرتب کیا۔اس کتاب کے بھی تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

مولانا سندھی مرحوم کی شخصیت، خدمات اور افکار کے تعارف کے سلسلے میں سرور صاحب کی یہ خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی اور انھیں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

۸۔ارمغان شاہ ولی اللہ

مولانا سندھی مرحوم کے افکار کی بنیاد چونکہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے علوم و معارف پر ہے اور انھوں نے شاہ صاحب کی حکمت و فلسفہ کے تعارف کے لیے جو دو خاص مقالے تحریر فرمائے، وہ شاہ صاحب کے مطالعے اور ان کے علوم و معارف کے فہم و بصیرت میں بہت اہمیت رکھتے ہیں، سرور صاحب کو مولانا سندھی سے عقیدت اور ان کے افکار سے دلچسپی تھی اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ ان کے مطالعے کا خود بخود موضوع بن گئے اور چونکہ عربی اور فارسی زبانوں پر انھیں عبور تھا اس لیے شاہ صاحب کی کتابوں سے استفادے میں انھیں کوئی دقت بھی پیش نہ آئی۔انھوں نے بہت سے مقالے حضرت شاہ صاحب اور ان کے عہد پر لکھے ہیں اور ایک کتاب شاہ ولی اللہ کی تعلیمات و افکار اور سوانح حیات میں ارمغان شاہ ولی اللہ کے نام سے مرتب کی ہے جو ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے شایع ہو چکی ہے۔

شاہ صاحب کی زندگی اور افکار و خدمات کے لیے مولانا محمد اسماعیل گودھروی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتابیں نہایت مفید ہیں۔اس سلسلے میں سرور صاحب کی یہ کوشش نہایت کامیاب ہے۔ اس تالیف کے بارے میں مولانا عبید اللہ انور لکھتے ہیں:

> "ارمغان شاہ ولی اللہ اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب ہے جسے شاہ ولی اللہ کی کتابوں کا خلاصہ اور نچوڑ کہنا چاہیے اور علوم قرآنی کے طلبہ کے لیے تو وہ ایک نعمت ہے۔"[۲۴]

دیگر تالیفات و تصنیفات

محمد سرور صاحب کی علمی خدمات مولانا سندھی اور شاہ ولی اللہ کے سوانح و افکار کی جمع و

تدوین اوران کی اشاعت تک ہی محدود نہیں بلکہ انھوں نے اور بھی کئی شخصیات اورتحریکات کو اپنے مطالعے اور نقد وتحریر کا موضوع بنایا ہے۔اس سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر کے مضامین اور خطوط کی دو جلدوں میں ترتیب، مولانا مودودی کی تحریک اسلامی اور جماعت اسلامی اور دستور اسلامی دو کتابیں اور شخصیات کے نام سے ایک مختصر کتاب ان کی علمی، ادبی خدمات، صحت فکر اور حقیقت پسندانہ نقطہ نظر پر شاہد ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر پراس تالیف کے بعد بھی کام ہوا ہے لیکن سرور صاحب کے کام کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔محمد علی جوہر کا مطالعہ کرنے والا کوئی شخص سرور صاحب کی کتابوں اوران پران کے مقدمات کے مطالب کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔مولانا مودودی اور ان کی تحریك اسلامی ایک تاریخ اور ایک تجزیہ ہے اور ہر تجزیے میں اختلاف کی بڑی گنجائش نکل آتی ہے۔لیکن سرور صاحب نے جس خوبی کے ساتھ اسلامی رومانیت کی تاریخ اور جماعت اسلامی کی تحریک کا تجزیہ کیا ہے، اسے کوئی شخص جوانصاف کے ساتھ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے، نظر انداز نہیں کر سکتا۔دوسری کتاب جماعت اسلامی اور دستور اسلامی بھی ان کی نہایت فکر انگیز کتاب ہے اور آئین سازی کے موجودہ دور میں تو جماعت اسلامی کے افکار وکردار کے نشیب وفراز کے مطالعے کے لیے نہایت مفید اوردلچسپ ہے۔

خالص ادبی نقطۂ نظر سے مجھے ان کی مختصر کتاب شخصیات بہت پسند ہے۔اس میں انھوں نے چند اکابر، سیاسی رہنماؤں، علمائے دین اور ادباء وشعراء کے بارے میں اپنا مطالعہ اور تاثرات بیان کیے ہیں۔یہ تمام وہ شخصیات ہیں جن کی خدمات یا فکروفن یا ان کے خصائص سیرت سے سرور صاحب متاثر ہوئے ہیں۔اکابر اور سیاست دانوں میں ڈاکٹر اقبال، مصطفیٰ کمال، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسرت موہانی ہیں۔مولانا محمد سورتی ان کے شفیق استاد تھے۔مولانا عبید اللہ سندھی ان کے فکر کے مربی، ڈاکٹر ذاکر حسین سے ان کے بہت قریبی تعلقات رہے ہیں اور وہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہیں۔

ادیبوں اور شاعروں میں جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، حفیظ جالندھری، ن م راشد اور بیدی، کرشن، اشک پر قلم اٹھایا ہے اور نہ صرف شخصیات اوران کے خصائل وخصائص اور فکروفن کا نہایت

عمدگی سے تعارف کرایا ہے بلکہ زبان کی شگفتگی، بیان کی دل آویزی اور اسلوب کی ندرت کاری کا نقش بھی دلوں پر ثبت کر دیا ہے۔

پروفیسر محمد سرور صاحب پر یہ مضمون میں نے ان کی زندگی میں ۱۹۷۳ء میں لکھا تھا اور ماہنامہ الـــولـــی، حیدرآباد (سندھ) میں چھپا تھا۔ اس واقعے پر ۳۴ برس گزر گئے۔ اس دوران ستمبر ۱۹۸۳ء میں پروفیسر صاحب کا انتقال بھی ہو گیا اور ۲۳ برس کے شب و روز اس حادثے پر بھی گزر گئے۔ اب مولانا سندھی پر اس تالیف میں اسے شامل کرنے کا خیال آیا اور نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ جن موضوعات و شخصیات سے عقیدت نے سرور صاحب سے دوستی کا رشتہ قائم کیا تھا، ان بزرگوں پر پچاسوں تصنیفات و تحقیقات شائع ہو چکی ہیں اور میں نے ان سے استفادے میں کوتاہی نہیں کی لیکن اس کے ساتھ سرور صاحب سے میری محبت اور ان کے علمی کاموں کے بارے میں بھی میری رائے زیادہ اچھی اور پختہ ہو گئی ہے۔

میں اس مضمون کو مرحوم کی خدمت کے اعتراف اور ان کی شخصیت کے احترام اور اظہار عقیدت کے لیے اس تالیف کا حصہ بناتا ہوں۔ مضمون میں نظر ثانی کے وقت زبان و بیان کی اصلاح اور تالیف مطالب میں بعض ترامیم و اضافات بھی ہوئے ہیں۔ میں اسے مولانا عبیداللہ انور کے مضمون کے ایک اقتباس پر ختم کرتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ پروفیسر محمد سرور کے بارے میں حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی رائے میری رائے سے بہت زیادہ اہم ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''سرور صاحب فطرت کا ایک عطیہ تھے جن کی دریافت مولانا سندھی ہیں اور مولانا سندھی نے ہمارے لیے شاہ ولی اللہ کو دریافت کیا اور شاہ ولی اللہ نے خیر القرون سے لے کر اپنے دور تک اسلام کے فلسفہ کو جس طرح مدون کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے اپنے محسنوں کی کبھی قدر نہیں کی جس کی سزا بھی انھیں ہمیشہ ملی لیکن اب وہ دور جلد آ رہا ہے کہ امام ولی اللہ کے افکار و آراء اور ان کے ذہنی کمالات کی مہریں ہر مفکرِ اسلام کے نظریات پر ثبت نظر آئیں گی ان شاء اللہ العزیز۔

سرور صاحب کا انتقال جہاں فکر ولی اللّٰہی کے قدر شناسوں کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے وہاں علم وادب کے لیے بھی ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ انھوں نے نام ونمود سے بچ کر ساری زندگی ٹھوس علمی وادبی خدمات انجام دیں اور شاہ ولی اللہ کی کتابوں کو اردو کا جامعہ پہنا تے وقت انھوں نے جن اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے، اس کا ایک زمانہ معترف ہے اور ولی اللّٰہی سوسائٹی کے لیے تو ان کا یہ کارنامہ ہمیشہ باعثِ فخر رہے گا۔ اس لحاظ سے ان کی موت لاریب ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک ادارے کی موت ہے۔"[۲۵]

تم کیا گیے کہ ہم پر قیامت گزر گئی!

حوالہ جات

۱۔ پروفیسر محمد سرور (مضمون) خدام الدین [لاہور] ۱۴ر نومبر ۱۹۸۳ء

۲۔ افادات و ملفوظات ،ص:۲۷

۳۔ افادات و ملفوظات محولہ بالا:۳۸-۳۵

۴۔ افادات و ملفوظات ،ص:۱۷

۵۔ افادات و ملفوظات ،ص:۱۶

۶۔ سعید احمد اکبرآبادی، مجذوب سندھی کی چند الھامی باتیں ،برھان [دہلی] اپریل ۱۹۵۰ء، ص:۲۳۲

۷۔ ایضاً، برھان [دہلی] ایضاً ،ص:۲۳۲

۸۔ افادات و ملفوظات :ص:۳۳-۱۳۲

۹۔ سعید احمد اکبرآبادی، مولانا عبید اللہ سندھی ،برھان [دہلی] جنوری ۱۹۴۵ء ص:۵

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد ،سندھ ساگر اکادمی [لاہور] ۱۹۴۶ء،ص:۱۲۳

۱۳۔ ایضاً، ص:۴۴

۱۴۔ پروفیسر محمد سرور، مولانا عبید اللہ سندھی (حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار) سندھ ساگر اکادمی [لاہور] ۱۹۶۷ء، ص:۹۲-۳۹۱

۱۵۔ مولانا عبید اللہ سندھی کابل میں سات سال ،سندھ ساگر اکادمی [لاہور] ۱۹۵۵ء، ص:۱۰۵

۱۶۔ بولیتھو، ھیکڑ جناح کریٹیٹر آف پاکستان ،۱۹۷

۱۸۔ افادات و ملفوظات ،ص:۱۲۵

۱۹۔ ایضاً ،ص:۱۳۸

۲۰۔ افادات و ملفوظات :ص:۳۱۰

۲۱۔ افادات و ملفوظات

۲۲۔ افادات و ملفوظات

۲۳۔ مولانا عبید اللہ سندھی شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ،سندھ ساگر اکادمی [لاہور] ۱۹۷۰ء، ص:۶

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ ہفت روزہ خدام الدین [لاہور] ۱۴ر نومبر ۱۹۸۳ء

ڈاکٹر سید شاہد علی *

معمارانِ جامعہ

[ایک تعارف]

آزادی ہند اور متحدہ قومیت کے نظریہ کو لے کر جو تعلیمی تحریک وجود میں آئی اسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس ادارے کی بنیاد ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء میں رکھی گئی تھی اور اس کا مقصد اعلیٰ تعلیم کو قومیت وطنیت کے رنگ میں رنگ دینا تھا۔ جامعہ نتیجہ تھا سیاسی تحریک کا لہٰذا اس کی ابتدائی پرداخت سیاست دانوں کے ذریعے ہوئی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن، حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی تحریروں اور تقریروں میں اس کے ان تین اہم مقاصد کو خاص طور سے بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ یہ تعلیم گاہ برطانوی حکومت کے اثر سے آزاد قومی اور ملی مصالح کی پابند ہو۔
۲۔ یہ ملک کی آزادی اور ہندوستانی قومی تحریک میں حصہ لے۔
۳۔ اس کی تعلیم میں دینی اور دنیاوی قدیم اور جدید عناصر کا صحیح امتزاج ہو۔

ابتدا میں جامعہ کی باگ ڈور سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی مگر ڈاکٹر ذاکر حسین کے زمانے

* پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵ ای میل: ssali@jmi.ac.in

سے اس کا تعلیمی رنگ نمایاں اور سیاسی رنگ پھیکا پڑتا گیا اور آگے چل کر اس نے خود کو سیاست سے بالکل الگ کر لیا۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۶ء تک جامعہ کی کشتی سخت پر آشوب طوفانوں میں گھری رہی۔ مشکل حالات میں جن حضرات نے اسے اپنی تمام تر قربانیوں کے ساتھ اس کی حفاظت کی اور اسے نشو ونما دی ان میں سے چند کا مختصر تعارف پیش ہے۔

حکیم اجمل خان

بابر کے زمانے میں حکیم صاحب کے آبا واجداد بخارا سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ ان کا گھرانہ علم طب میں ممتاز مانا جاتا تھا۔ اجمل خاں کی پیدائش ۱۸۶۴ء میں ہوئی۔ تعلیم سے فراغت اور فنِ طب میں کمال حاصل کرنے کے بعد حکیم اجمل خاں ۲۸ سال کی عمر میں رام پور کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ یہ دور موصوف کی زندگی کا اہم دور تھا کیونکہ وہاں طبی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ قدیم کتب خانہ کی نگرانی کا کام بھی کرتے تھے۔ رام پور میں آپ نے قدیم قلمی نسخوں کی بڑی تعداد سے استفادہ کیا۔ وہاں قیام کے دوران حکیم صاحب مسلمانوں کی تقریباً سبھی سماجی وتعلیمی تحریکات سے جڑ گئے کیونکہ وہ سبھی کسی نہ کسی شکل میں رام پور سے مالی تعاون حاصل کر رہی تھیں۔

حکیم اجمل خاں کی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی تھی، مگر آپ ترقی پسند رجحانات کی تائید وحمایت کرتے تھے۔ حکیم صاحب مولانا عبیداللہ سندھی کے نظارت المعارف کے سرپرست اور مولانا محمود حسن کی سیاسی تحریک میں ان کے معاون تھے۔ آپ علم طب کی ترقی واصلاح کے سخت حامی تھے نیز ایلوپیتھی سے بھی استفادہ کو برا خیال نہ کرتے تھے۔ حکیم صاحب نے اپنی تمام تر زندگی یونانی اور آیورویدک طریقہ علاج کے مطالعے اور ان کو ہم آہنگ کرنے میں گزار دی۔ ۱۹۱۰ء میں آپ نے انگلستان، فرانس اور اسٹریلیا کے ڈاکٹروں سے ملاقاتیں کی اور وہاں کے ہسپتالوں، دواخانوں کا بغور جائزہ لیا اور ان کی اچھی باتوں کو یہاں اپنانے پر زور دیا۔

۱۹۰۲ء میں رام پور سے دہلی واپسی پر پہلا کام اپنے خاندانی ورثہ مدرسہ طبیہ کی اصلاح کا کیا اور مشترکہ خاندانی ملکیت ہندوستانی دواخانہ خرید کر مدرسہ طبیہ کے لیے وقف کر دیا۔ ۱۹۰۹ء میں مدرسہ طبیہ میں زنانہ شعبہ قائم کیا۔ ۱۹۱۶ء میں مغربی طب کی جدید تحقیقات اور طب یونانی کے سنگم کے مقاصد

سے انڈیا کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ ہندوستان میں طبی تحریک کے بانی آپ ہی ہیں۔ جب فروری ۱۹۰۶ء میں پہلی طبی کانفرنس بلائی گئی۔ یہ ملک کے اطبا اور ویدھوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش تھی اور اس کے زیر اثر ملک میں جگہ جگہ طب یونانی کے کالج قائم ہوئے۔ آپ کی کوششوں کے نتیجے میں حکومت سے امداد ملنے لگی اور حکومتی سطح پر قدیم طریقہ علاج کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔

حکیم اجمل خاں کے خاندان کا دہلی کی سبھی تعلیمی وتہذیبی سرگرمیوں سے گہرا تعلق رہا۔ بیس سال تک آپ علی گڑھ کے ٹرسٹی رہے، اس کے علاوہ ۱۹۱۰ء کے ندوۃ العلماء کے دلی اجلاس میں آپ صدر رہے، اور جب شبلی ودار العلوم ندوۃ العلماء میں اختلاف بڑھے تو آپ ہی نے مولانا آزاد کے ساتھ مل کر مصالحت کرائی۔ علی گڑھ اور ندوۃ العلماء کے بعد آپ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے جڑ گئے اور جامعہ کے پہلے امیر جامعہ (چانسلر) منتخب ہوئے۔ جامعہ پر برا وقت پڑنے پر اسے علی گڑھ سے ۱۹۲۵ء میں دہلی لے آئے اور تمام عمر اس کی بھرپور کفالت کی۔ آپ کے بارے میں مولانا محمد علی فرماتے ہیں:

> ''طبیہ کالج حکیم اجمل خان کی جوانی کی اولاد ہے اور جامعہ ان کے بڑھاپے کی''

حکیم صاحب ہندو مسلمان سبھی میں ایک مشفق اور بزرگ کی حیثیت سے مقبول تھے۔ جب بھی دونوں میں یا خود مسلمانوں میں اختلافات بڑھتے، تو آپ ہی آگے آکر صلح صفائی کراتے۔ تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ آپ نے جدوجہد آزادی میں بھی اہم رول ادا کیا۔ ترکِ موالات اور عدم تعاون کی تحریکوں میں حکیم صاحب نے گاندھی جی اور مولانا محمد علی کا ساتھ دیا۔ آپ کا شمار کانگریس اور خلافت تحریک کے ممتاز رہنماؤں میں ہوتا تھا۔

حکیم صاحب کی تعلیمی کوششوں کو آپ ہی کے الفاظ میں ۱۹۲۱ء میں جامعہ کے اول تقسیم اسناد کے موقع پر صدارتی خطبہ میں اس طرح سنا گیا:

> ''ہم نے اصولی حیثیت سے تعلیم کو صحیح شاہراہ پر ڈال دیا ہے اور جہاں ہم نے سچے مسلمان پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کی وہیں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے کہ تعلیم وتربیت میں ماحول کا بہت

بڑا اثر ہوتا ہے اور اسلامیت کے ساتھ وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ چنانچہ اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے کہ جہاں ہندو طلباء کے لیے بہت سے اسلامی معاملات پر معلومات حاصل کرنا ضروری ہے وہاں مسلمان طلباء بھی اہم ہندو رسم اور ہندو تہذیب و تمدن سے آشنا رہیں۔ ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کی اساس اس باہمی تفہیم و تفہم پر منحصر ہے۔''

مولانا محمد علی

مولانا محمد علی کی پیدائش رام پور میں ۱۸۷۸ء میں ہوئی، علی گڑھ سے بی اے کی ڈگریاں لیں، رام پور کے چیف ایجوکیشن آفیسر اور بڑودا کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں علی گڑھ کی اندرونی شورشوں کے سبب دو گروپ بن گئے تھے جن میں ایک کی پیروی مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کر رہے تھے۔ مسٹر محمد علی کو بنانے میں صحافت و سیاست کا بڑا ہاتھ رہا۔ ۱۹۱۱ء میں محمد علی نے انگریزی اخبار کامریڈ اور ۱۹۱۲ء میں اردو اخبار نکالا اور بہت جلد ایک کامیاب صحافی کے طور پر جگہ بنالی پہلی جنگ عظیم کے موقع پر کامریڈ نے ترکوں کی طرف داری کی۔ نتیجے کے طور پر وہ ضبط کر لیا گیا اور آپ نظر بند کر دیے گئے۔ جب ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے تو ایک صحافی کے علاوہ سیاسی رہنما بھی بن چکے تھے اور بہت جلد خلافت کمیٹی پر اس طرح چھا گئے کہ لوگ اس کے بانیوں کو بھول گئے۔ اپنے ملک کے مسلمانوں کو ترکِ موالات کا پیغام دیا اور ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے صدر چنے گئے۔ سیاسی مصروفیات کے سبب آپ کو جامعہ کی سرپرستی کے لیے بہت کم وقت ملا، شیخ الجامعہ کی حیثیت سے صرف چھ ماہ کام کر سکے، حکیم اجمل خاں کی وفات کے بعد جامعہ کو بربادی سے بچانے اور مالی بحران دور کرنے کے لیے ذاکر صاحب کے ساتھ چندہ جمع کرنے برما گئے، گول میز کانفرنس کے لیے لندن پہنچے، اور وہاں جا کر کہا میں آزادی لیے بغیر ہندوستان واپس نہ لوٹوں گا۔

''آزادی تو نہ ملی مگر آپ زندگی کی قید سے آزاد ہو گئے''

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

ڈاکٹر مختار انصاری ۱۸۸۰ء میں یوسف پور میں پیدا ہوئے، ۱۸۹۹ء میں نظام کالج حیدرآباد سے سائنس میں انٹرمیڈیٹ کی ڈگری لی، بعد میں لندن کے شفاخانے کراس ہاسپٹل میں سرجن رہے، دس سال وہاں رہ کر ۱۹۱۰ء میں ہندوستان آئے اور ۱۹۱۷ء میں پوری میں اپنا کلینک کھولا۔ حکیم اجمل خاں سے آپ کی ملاقات لندن میں ہوئی اور محمد علی سے ہندوستان میں، تب ہی سے ساتھ مل کر کام کرنے لگے، آپ میں مسلمانوں کی ہمدردی کا شدید جذبہ تھا۔ جنگ بلقان میں ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو ایک طبی مشن لے کر ڈاکٹر انصاری ترکی روانہ ہوئے اور کئی ماہ بعد واپس آئے۔ خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

بنیادی طور پر موصوف ایک ڈاکٹر تھے، آپ نے دہلی میڈیکل کے قیام میں اہم رول ادا کیا، آپ کی زندگی کا زیادہ بڑا حصہ سیاسی و تعلیمی سرگرمیوں میں گزرا، جامعہ سے آپ کا تعلق علی گڑھ کے زمانے سے رہا، آپ وہاں مجلس انتظامیہ کے رکن تھے اور جب جامعہ دہلی آئی تو سیکرٹری کے عہدے پر نامزد ہوئے اور حکیم اجمل خاں کی موت کے بعد امیر جامعہ بنائے گئے، آخر تک اس عہدے پر قائم رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسلم لیگ اور کانگریس کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی بہت کوششیں کی۔ ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے صدر بنے، آپ کے بارے میں گاندھی جی نے کہا تھا ڈاکٹر انصاری ایک سرجن ہیں اور انھوں نے تہیہ کیا ہے کہ ہندو مسلم تعلقات کی شکستگی کی مرہم پٹی کریں گے۔ وہ ہمارے سرجن ہیں انھیں ہم نے طلب کیا ہے۔ جو کام انھوں نے اپنے سر لیا ہے اس میں اگر ہم پوری طرح سے ان کی مدد نہیں کرتے تو غلطی ان کی نہیں ہے ہماری ہے۔

عبدالمجید خواجہ

عبدالمجید خواجہ اکتوبر ۱۸۸۵ء میں علی گڑھ کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے، علی گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیمبرج سے بی اے اور لندن سے بیرسٹری کی ڈگریاں لیں، کیمبرج میں خواجہ صاحب جواہر لال نہرو کے ساتھی تھے، ہندوستان واپسی پر الہ بادہائی کورٹ میں بیرسٹر رہے، ترکِ

موالات اور عدم تعاون کی تحریکوں کے اثر سے بیرسٹری چھوڑ کر جنوری ۱۹۲۱ء میں جامعہ سے منسلک ہو گئے، ۲۹/اپریل ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۶ء تک شیخ الجامعہ کے عہدے پر فائز رہے، وفات ۱۲/دسمبر ۱۹۶۲ء تک اسی عہدے پر رہے۔

جامعہ کی زندگی میں آپ کی دو اہم خدمات ہیں پہلی یہ کہ عبدالمجید خواجہ نے جامعہ پر لگی سیاسی چھاپ کو پھیکا کیا اور اسے خالص تعلیمی راہ پر ڈالا۔ اگر موصوف ایسا نہ کرتے تو سیاسی حالات بدلتے ہی اس کا وجود ختم ہو جاتا اور دوسرا اہم کام یہ کیا کہ جامعہ کو علی گڑھ سے اس کے تمام اثاثہ کے ساتھ دہلی منتقل کرایا اور مشکل حالات میں اسے گرنے سے بچایا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین ایک معزز پٹھان گھرانے میں آٹھ فروری ۱۸۹۷ء میں ضلع فرخ آباد کے قصبہ قائم گنج میں پیدا ہوئے، اٹاوا، علی گڑھ اور الہ باد یونیورسٹیوں سے تعلیم پائی اور جرمنی سے معاشیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ آپ بچپن ہی سے بہت ذہین تھے طالب علمی کے زمانے میں ہی افلاطون کی کتاب جمہوری ریاست ریپبلک کا اردو ترجمہ کر دیا تھا۔ ذاکر صاحب جامعہ کے تیسرے شیخ الجامعہ اور چوتھے امیر جامعہ کے علاوہ بہار کے گورنر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر، ہندوستان کے نائب صدر اور تیسرے صدر جمہوریہ وغیرہ کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ آپ کی وفات تین مئی ۱۹۶۹ء میں دہلی میں ہوئی۔

جب ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جامعہ کا قیام عمل میں آیا، ذاکر حسین ان چند طلبہ میں شامل تھے جو مہاتما گاندھی اور علی برادران کی تحریک پر خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکوں سے متاثر ہو کر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کو چھوڑ آئے۔ اس وقت موصوف وہاں معاشیات میں ایم اے کرنے کے ساتھ تدریسی فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔ جامعہ میں تقریباً دو سال کام کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی تشریف لے گئے۔

ذاکر صاحب کی غیر موجودگی میں جامعہ کی کشتی گرداب کا شکار ہو کر بند ہونے کے قریب تھی۔ موصوف نے جرمنی سے واپسی تک اسے بند نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ جس کے بعد حکیم صاحب

اسے علی گڑھ سے دہلی لے آئے۔ ۱۹۲۶ء میں جرمنی سے واپسی پر انھیں جامعہ کا شیخ الجامعہ بنا دیا گیا۔ اس وقت موصوف کی عمر صرف انتیس سال تھی۔ جامعہ کی نازک گھڑی میں اسے بچانے کے لیے انجمن تعلیم ملی کی بنیاد ڈالی گئی۔ ڈاکٹر انصاری کو اس کا صدر، ذاکر صاحب کو سکریٹری اور سیٹھ جمنالال بجاج کو خازن مقرر کیا گیا۔ اس سوسائٹی میں دو طرح کے ممبر تھے؛ ایک معاون ممبر اور دوسرے حیاتی ممبر۔ وہ ممبر جنھوں نے بیس سال تک زیادہ سے زیادہ ایک سو پچاس روپے ماہوار پر جامعہ کی خدمت کرنے کا عہد کیا تھا۔ ابتدا میں ان حیاتی رکن کی تعداد گیارہ تھی۔ عہد تو ان کا ایک سو پچاس روپے کا سے زیادہ نہ لینے کا تھا مگر درحقیقت اس کی حد کو کبھی نہ پہنچے۔ خود ذاکر صاحب کی تنخواہ چھہتر روپے ماہوار تھی وہ بھی باقاعدگی سے نہ ملتی تھی۔ اس قلیل رقم پر موصوف نے اپنی زندگی کے بیس سال بسر کیے اگرچہ آپ چاہتے تو آپ کے لیے دولت کی کمی نہیں تھی۔ یقیناً قوم کے لیے یہ آپ کی ایک بے مثال قربانی تھی۔ ذاکر صاحب نے پورے بائیس سال تک جامعہ کی خدمت کی اور آزادی کے بعد ضرورت کے پیش نظر علی گڑھ سے منسلک ہو گئے اور وہاں کے وائس چانسلر کے عہدے کو قبول کر لیا مگر قدم آپ نے تب اٹھایا جب جامعہ میں قابلِ اساتذہ کی ایک جماعت تیار کر چکے، البتہ آخر سانس تک جتنا ممکن ہو سکا جامعہ کی خیر خواہی کرتے رہے۔

ذاکر صاحب گاندھی جی سے اور گاندھی جی آپ سے بہت متاثر تھے، یہی وجہ تھی کہ گاندھی جی نے ۱۹۳۷ء میں اپنے بنیادی تعلیم کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی، اس کا صدر ذاکر صاحب کو بنایا تھا۔ تب تک آپ اندرون اور بیرون ملک ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔

ذاکر صاحب کے تعلیمی افکار کو آپ کے تعلیمی خطبات (شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۴۳ء) یعنی مختلف یونیورسٹیوں میں جلسہ اسناد کے موقع پر پیش کیے گئے خطابات (ڈائمک یونیورسٹی ۱۹۶۵ء) اوران کے ولب بھائی پٹیل یادگاری لیکچر ۱۹۵۸ء ''ہندوستان میں تعلیم کی از سرنو تنظیم'' سے سمجھا جا سکتا ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی آپ کی کہانیاں جیسے ابو خان کی بکری اور چودہ کہانیاں (مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی) '' کچھوا اور خرگوش'' (نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا ۱۹۷۰ء) وغیرہ بچوں کے اعلیٰ اخلاقی تربیت کے لیے بہت اہم ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب کا تعلیمی فلسفہ یہ تھا:

''تعلیم معلومات کے خزانے کو اکٹھا کرنے کو نہیں کہتے بلکہ اسے کہتے ہیں کہ آدمی جو دماغی قوتیں لے کر پیدا ہوا ہے ان میں ترقی کا جتنا امکان ہو وہ اسے حاصل کرے۔ معلومات کے خزانے کو پانے سے آدمی انسان نہیں بنتا بلکہ اسے صحیح استعمال کا طریقہ بھی وہ جانے۔ علم الگ شے ہے اور تعلیم الگ شے ہے۔ علم اگر موتی ہے تو تعلیم اس موتی کو نگینہ میں جوڑنے کا عمل، تعلیم کا کام درس وتدریس سے کچھ مختلف ہے، یہاں ذہنوں کو مانجھا جاتا ہے اور ان میں تخلیقی قوت پیدا کی جاتی ہے جیسا کہ دھات کو مقناطیس کے گرد گھما کر برقی قوت پیدا کی جاتی ہے۔ تعلیم وتربیت کے ذریعے قدرت یہ چاہتی ہے کہ جس طرح شہد کی مکھی گلاب کے رس سے شہد تیار کرتی ہے یا گائے ہری گھاس سے امرت والا دودھ دیتی ہے انسان بھی ایسے اخلاقی اقدار پیدا کرے جن سے وہ صحیح معنوں میں اس کرہ ارض کا خلیفہ بن سکے۔''

خلاصہ یہ ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے جارج کوشین اسٹائنز کی اس بات پر اپنی تمام عمر عمل کیا ہے:

''ایک تعلیم یافتہ شخص خود کو کبھی بھی مکمل محسوس نہیں کرسکتا، فطرتاً تعلیم کے لیے جدوجہد کرنا صحیح تعلیم کی ایک اچھی نشانی ہے۔''

مولانا ابوالکلام آزاد

آپ کا تعلق ہندوستانی مسلمانوں کی تین بڑی علمی تحریکوں سے رہا ہے۔ علی گڑھ، ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ اسلامیہ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ تقلید جامد کے سخت مخالف اور ترقی کے لیے صحت مند تغیر کے حق میں تھے جو آپ کے مطابق ایک زندہ قوم کی علامت ہے۔ حکیم اجمل خان کی وفات کے بعد جامعہ شدید شخصی ومالی بحران کا شکار ہوگئی تھی، ایسے میں مولانا کی کوششوں سے ہی صرف مدراس ہی سے

اتنا کچھ مل گیا کہ جامعہ کا مالی بحران دور ہو گیا، اس کے علاوہ بھی تمام عمر آپ جامعہ کی ہر طرح مدد کرتے رہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نام بھی درحقیقت مولانا آزاد ہی کی دین ہے۔ جامعہ کا لیٹر پیڈ مولانا آزاد نے ہی چھپوایا تھا جس میں آپ نے نیشنل مسلم یونیورسٹی کا انگریزی کے علاوہ عربی ترجمہ جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی لکھوادیا جو بعد میں بہت پسند کیا گیا اور رائج ہو گیا۔

پروفیسر محمد مجیب

۳۰؍ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو آپ کی پیدائش ہوئی، ۱۹۲۲ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے تاریخ میں بی اے کی ڈگری لی اور ۱۹۹۲ء میں استاد کی حیثیت سے جامعہ میں کام شروع کیا۔ ۱۹۴۸ء میں جامعہ کے چوتھے شیخ الجامعہ بنے۔ آپ نے مختلف بین الاقوامی معاملات میں حکومت ہند کی نمائندگی کی، غیر ملکی یونیورسٹیوں میں لیکچرز دیے، میک گل یونیورسٹی مونٹریال میں وزنگ پروفیسر کے حیثیت سے رہے۔ ۱۹۶۲ء میں آپ کی کوششوں سے جامعہ کو یونیورسٹی کا درجہ ملا۔ ۱۹۶۵ء میں آپ کو بھارت سرکار کی طرف سے پدم بھوشن کا ایوارڈ ملا۔ شیخ الجامعہ کے عہدے پر ۲۵ سال اور مجموعی طور پر ۴۷ سال جامعہ سے منسلک رہے۔ شدید بیماری کے سبب ۱۹۷۲ء دماغ کا آپریشن ہوا جس کی وجہ سے آپ کی یادداشت جاتی رہی۔ روسی، جرمنی، فرانسیسی، انگریزی اور اردو سبھی زبانیں بھول گئے لیکن بعد میں سخت محنت کی اور انگریزی سیکھ لی۔

ابتدا میں جامعہ کے مصارف کی ذمہ داری خلافت کمیٹی پر تھی، ۱۹۲۴ء میں خلافت تحریک کے ختم ہو جانے کے سبب جامعہ کے بند ہونے کی نوبت آگئی، ذاکر صاحب نے جرمنی سے خط لکھا کہ ان کے واپس آنے تک اسے بند نہ کیا جائے اور وہ اپنے ساتھ اپنے دو ساتھیوں ڈاکٹر عابد حسین اور محمد مجیب کو جامعہ لا رہے ہیں جو اپنی زندگیاں جامعہ کے لیے وقف کرنے کو تیار ہیں۔ اس وجہ سے حکیم اجمل خان جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی لے آئے اور اس کا تمام خرچہ اٹھاتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد مسائل بڑھ گئے، ۱۹۲۸ء میں جامعہ کو چلانے کے لیے انجمن تعلیم ملی کی بنیاد رکھی گئی، اس کی اس کے ابتدائی گیارہ حیاتی ممبران میں سے پروفیسر مجیب بھی ایک تھے۔ درحقیقت جامعہ مجیب صاحب کے رابطہ میں آنے کے بعد اپنی بقا و نشو نما کے مراحل سے آسانی سے گزر گئی۔ اپنے عہد میں مجیب صاحب

نے جامعہ کے مالی مسائل کی کمی کو دور کرنے کے لیے کارکنوں، طلباء اور استادوں میں کام کی لگن اور عمل کا جوش تازہ کرنے کے لیے اعلیٰ تعلیمی میدان میں اسے اوپر لانے اور عمارتوں کی کمی کو دور کرنے کا اہم کام کیا، اور سب سے اہم بات یہ کہ آزادی ہند کے بعد جامعہ کی انفرادیت کو باقی رکھنا مشکل ہو رہا تھا مگر آپ نے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر جامعہ کی انفرادیت کو باقی رکھا۔ آپ کی انہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۶۲ء میں جامعہ کو اعلیٰ تعلیمی ادارے کی حیثیت مل گئی۔

ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاکٹر سید عابد حسین کی پیدائش بھوپال میں ۱۸۹۹ء میں ہوئی، الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کیا، ۱۹۲۲ء میں آکسفورڈ میں چھ ماہ ہسٹری آنرس میں تعلیم پائی، برلن میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ء کے دوران ایم اے کیا اور پروفیسر اسپرنگر کے زیر نگرانی ہربرٹ کے فلسفہ تعلیم پر پی ایچ ڈی حاصل کی ۱۹۲۶ء سے ۱۹۵۶ء تک جامعہ میں ادبیات، اردو فارسی کے پروفیسر رہے، سات سال تک جامعہ کالج کے پرنسپل رہے اور جامعہ کے مجلس اور خازن بھی رہے۔ آپ نے جامعہ رسالہ کی ادارت کی اور آپ پیام تعلیم کے مؤسس تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی غیر موجودگی میں قائم مقام شیخ الجامعہ رہے اور جامعہ کے لائف ممبر اور ٹرسٹی رہے، اسلام اینڈ ماڈرن ایج سوسائٹی قائم کی، علی گڑھ میں جنرل ایجو کیشن کے ڈائریکٹر رہے، جامعہ اردو اکادمی کے روح رواں آپ ہی تھے، آپ نے جرمن کتابوں کا اردو میں اور گاندھی و نہرو کی کتابوں کے ترجمے بھی کیے آپ ایک ایسے شیعہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو شیعہ و سنی تعصب سے پاک تھا۔ آپ کی دادی اور پردادی دونوں سنی تھیں آپ اپنے عقائد میں پختہ مگر اس کے ساتھ رواداری کے حامی تھے۔ آپ کی شخصیت پر اساتذہ میں پروفیسر ایڈورڈ اسپرنگر اور دوستوں میں سیدین اور ذاکر صاحب کے اثرات تھے۔ تعلیمی فلسفے میں آپ پر افلاطون اور ہربرٹ اسپینسر کا گہرا اثر رہا۔

جامعہ سے موصوف کا تعلق ذاکر صاحب کے ذریعے سے ہوا۔ عابد صاحب نے جامعہ کے لیے اپنی تمام زندگی وقف کرنے کا ارادہ کیا تھا، یہی وجہ تھی کہ ۱۹۵۶ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد بھی یہیں مقیم رہے جامعہ کو ایک اعلیٰ تعلیمی درسگاہ بنانے میں تعاون کیا اور اردو زبان کو جرمن اور دیگر زبانوں کی

کتابوں سے تراجم کے ذریعے مالامال کردیا۔آپ کی تعلیمی نظریات حسبِ ذیل ہیں:

(۱) تعلیم عبارت ہے کسی فرد کی تہذیبی روایت اور وہ سماج جس میں اس نے آنکھیں کھولیں ان دونوں کے مابین ایک تخلیقی ہم آہنگی کا شعور بہم پہنچانے سے۔ اس کے علاوہ جہاں تک ممکن ہو سکے تمام تر انسانی معاشرے کی مشترکہ وراثت (مشترکہ تہذیبی اقدار اور ثقافتی عطیات) کی آگہی بخشنے سے۔ یہ کوشش اس طور پر کی جانی چاہیے کہ تعلیم حاصل کرنے والے کی مخفی توانائیوں کو ابھرنے کا موقع ملے تاکہ یہ توانائیاں اپنے باہم ادغام سے ایک مبسوط اکائی بن سکیں اور تعلیم حاصل کرنے والے کی شخصیت کی نشو ونما ایک ہمہ گیر سطح پر ہو۔

(۲) دوسرے یہ کہ انسانی وجود کی بنیادی صلاحیتیں جن میں موجود اقدار کو مقدس کہا جا سکے وہ ہیں، مذہبی جمالیاتی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی اقدار۔

(۳) ان نصف درجن صلاحیتوں میں مذہبی صلاحیت یا دوسرے لفظوں میں زندگی کو صحیح رخ سے اور اپنے تمام تر کلیت کے ساتھ دیکھنے کی صلاحیت کو بچے کی تعلیم کا مرکزی نقطہ سمجھنا چاہیے۔

دوسری صلاحیتوں کی تعمیر کسی نقطے کے گرد ہونی چاہیے، صرف اسی صورت میں ایک بسیط خاکہ، ایک آزاد لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک مربوط اور اپنی تہذیب کے ذریعہ ظہور پذیر ہونے والی شخصیت کی تعمیر ممکن ہو سکے گی''۔

خلاصہ یہ ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بنانے میں مختلف عظیم شخصیتوں کی زبردست قربانیاں شامل ہیں۔ان سب کا مختصر طور پر احاطہ کرنا ممکن نہیں البتہ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بانیان جامعہ میں ایک مشترکہ خوبی یہ پائی جاتی تھی کہ ان سب میں ملت کا درد موجود تھا جس نے انھیں اپنی دنیاوی کامیابیوں اور عیش وعشرت کی زندگی کو چھوڑ کر مسائل ومصائب کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔موجودہ

حالات میں ضرورت ہے اپنی زندگیوں کو ان کی زندگیوں سے تقابل کرنے کی تا کہ ہم میں بھی ملت کی پستی وتنزلی کو دور کرنے کا حوصلہ وعزم پیدا ہو۔ درحقیقت ان حضرات کی زندگیاں پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک کی زندہ تصویر تھی۔

''سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں اگر اس کی آنکھ بھی دُکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے''۔

ماخذ

۱۔ حیاتِ عابد ،ڈاکٹر صغری مہدی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (دہلی) ۱۹۸۴ء ص:۸۷

۲۔ ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک ،شمس الرحمٰن محسن، مکتبہ جامعہ (دہلی) ص:۲۸
حکیم اجمل خان کی زبان حیات کے لیے دیکھیے :حیات اجمل مرتبہ: قاضی عبدالغفار

۳۔ ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک ،شمس الرحمٰن محسن، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (دہلی)

۴۔ موجِ کوثر ،شیخ محمد اکرام، تاج کمپنی (دہلی) ۱۹۹۱ء ص:۱۴۳

۵۔ ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک ،شمس الرحمٰن محسن، مکتبہ جامعہ (دہلی) ص:۲۷

۶۔ ایضاً ص:۲۸

۷۔ محمد علی کے لیے دیکھیے ان کی کتاب

۸۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سوانح حیات کے لیے دیکھیے رسالہ جامعہ 'ڈاکٹر انصاری کی یاد' میں شمارہ جون جولائی ۱۹۸۱ء

۹۔ ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک ،شمس الرحمٰن محسن، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (دہلی) ص:۲۱

ڈاکٹر تجمل حسین خاں *

جامعہ ملیہ اسلامیہ
کا
تاریخی و تعلیمی سفر

ہندوستان کی تاریخ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک وقیع حیثیت کا حامل منفرد تعلیمی ادارہ ہے۔ کوئی ادارہ دفعتاً وجود میں نہیں آتا، اس کے پیچھے کچھ مختلف عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ ان عوامل کے ساتھ ساتھ کچھ مقاصد بھی ہوتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے پیچھے جو عوامل و مقاصد کارفرما تھے ان کی حقیقت کو جاننے کے لیے ہمیں تاریخ کے اوراق کو پلٹنا ہوگا۔

ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی میں ۱۹۱۹ء کا سال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وہ سال تھا جب ہندوستان کی سیاست میں گاندھی جی نے قدم رکھا۔ اپنی آمد سے لے کر ۱۹۴۷ء یعنی ہندوستان کو آزادی ملنے تک گاندھی جی ہندوستان کی سیاست میں ملک کے سب سے بڑے رہنما بن کر ابھرے۔ گاندھی جی کی رہنمائی میں تحریکِ آزادی مختلف مراحل سے گزری۔ جس میں رولٹ ایکٹ، جلیان والا باغ، تحریک خلافت، سائمن کمیشن، تحریک عدم تعاون اور پورن سوراجیہ کی مانگ ایک خاص تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔

جامعہ کے قیام سے قبل ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایک ادارہ ایم اے او کالج

کے نام سے وجود میں آچکا تھا، جو آگے چل کر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں تبدیل ہوگیا، اس کے بانی سرسید احمد خاں تھے، لیکن یہ ادارہ حکومت کی مداخلت سے آزاد نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ یہاں ذریعہ تعلیم بھی انگریزی تھا۔ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرنا معیوب سمجھتے تھے۔ میکالے کا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے ہی ہندوستانی باشندوں کی نجات ہوسکتی ہے، اسی لیے سرکاری ملازمتوں میں انگریزی تعلیم کولازمی قرار دینے سے وہ پچھڑ گئے۔ حالاں کہ سرسید نے مسلمانوں کی وقتی ضرورت کے پیشِ نظر علی گڑھ کالج قائم کردیا تھا، لیکن اس ادارے پر انگریزی سرکار کی گرفت مضبوط تھی۔ چناں چہ سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق ایک اسکیم سید محمود سے تیار کروائی جس میں یہ کہا گیا تھا:

> یہ بات قطعی ناممکن ہے کہ برطانوی حکومت ہماری ان حاجتوں کو جو تعلیم وتربیت سے تعلق رکھتی ہیں پورا پورا سمجھے یا ان کا کامل طور پر بندوبست کرسکے۔ اگر ہمیں کچھ روپے کی مدد حکومت دے تو ہمیں اس کی نگرانی پر کچھ عذر نہ ہوگا۔ بہ شرطیکہ ہمارے انتظام میں کچھ مداخلت نہ ہو۔[1]

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام میں دو تحریکوں کا خاصا بڑا رول رہا ہے۔ اول خلافت تحریک دوم تحریک عدم تعاون۔ ترکی نے خلافت کے ذریعے مسلمانوں کی شیرازہ بندی کا کام سرانجام دیا تھا۔ اس لیے دنیا کے تمام مسلمانوں کے دلوں میں ترکی کے لیے عقیدت واحترام کے جذبات موجود تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد جس وقت ہندوستانی رہنما جیل سے نکلے اس وقت تمام دنیا میں مسلمانوں کی حالت بہت ابتر تھی۔ اتحادی ممالک ترکی سلطنت کے حصے بخرے کررہے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں ترکی کے ساتھ ہورہے اس ظالمانہ رویے کے خلاف غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ملک کے کونے کونے میں ان مظالم کے خلاف جلسے، جلوس اور مظاہرے ہونے لگے۔ ہندوستانی مسلمانوں نے شوکت علی اور محمد علی کی رہنمائی میں انگریزوں کے خلاف ایک تحریک شروع کی جو خلافت تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔

خلافت کمیٹی ۲۰ رنومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں قائم ہوئی۔ اس کمیٹی نے انگریزی حکومت کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور مسلم ملکوں کی حفاظت اور خلافت کو قائم رکھنے کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کو منظم کیا۔ یہ کام اس جوش وخروش کے ساتھ کیا گیا کہ صرف چند ہی مہینوں میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بیداری کی لہر دوڑ گئی اور مسلم رہنما جنھوں نے علی گڑھ کالج کو قائم کیا تھا، وہ اسے ایک آزاد یونیورسٹی

بنانے کا خواب دیکھنے لگے۔ان کے دل میں یہ بات گھر کر گئی کہ وہ اپنے تعلیمی ادارے کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرائیں گے۔چناں چہ اس کے لیے کوششیں شروع کردی گئیں۔

۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون کا آغاز کیا۔اس تحریک کا مقصد انگریزی سرکار کو کسی بھی قسم کا تعاون نہ دینا تھا۔خلافت تحریک اور عدم تعاون تحریک آپس میں متحد ہو گئیں۔طالبِ علموں نے سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کیا۔وکیلوں نے عدالت میں جانا بند کردیا۔علی گڑھ کالج کے کچھ طالب علم جو خلافت تحریک سے دلچسپی رکھتے تھے، وہ علی برادران کے ہم نوا ہو گئے۔انھوں نے علی برادران کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی کہ وہ ترکِ موالات کا پیغام دیں۔محمد علی جوہر نے گاندھی جی سے کہا کہ تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ علی گڑھ سے شروع کیا جائے لہٰذا محمد علی جوہر اور گاندھی جی کی قیادت میں علی گڑھ سے ترکِ موالات کا پیغام سنایا گیا۔لیکن کالج کے کار پردازوں نے یہ انتظام کیا تھا کہ کسی بھی طرح جلسہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے پائے اور یہی ہوا۔جس سے علی برادران دل برداشتہ ہوئے اور علی گڑھ سے لوٹ آئے۔لیکن نوجوان طلبا اور اساتذہ نے بائیکاٹ شروع کردیا۔اس کے بعد یہ تجویز پاس ہوئی کہ علی گڑھ کو انگریزی حکومت کی مداخلت سے آزاد کرایا جائے یا پھر دوسرا تعلیمی ادارہ معرضِ وجود میں لایا جائے۔مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی اور دوسرے مسلم اہلِ فکر اور سیاسی کام کرنے والوں نے طلبا کے اس مطالبے پر غور وخوض کیا۔

علی گڑھ کے منتظمین کو جب اپنا اقتدار خطرے میں نظر آیا تو انھوں نے علی گڑھ کو بچانے کے لیے طلبا کو سمجھانے کی کوشش کی۔جب ان سے اپنی بات نہ منوا سکے تو ان کے والدین سے رجوع کیا۔طلبا کو نوکری اور وظیفوں کا لالچ دے کر سبز باغ دکھائے گئے۔غرض طلبا کو منتشر کرنے کے لیے علی گڑھ کے منتظمین نے ہر ممکن کوشش کی۔لیکن طلبا کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔طلبا کا کھانا، ڈائننگ ہال سے بند کردیا گیا مگر طلبا نے کھانے کا انتظام بھی خود کرلیا۔کالج کے منتظمین کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو انھوں نے گرتے ہوئے اقتدار کو سنبھالنے کے لیے پولیس کی مدد لی۔ایک دن صبح سویرے کالج کے چاروں جانب پولیس نے گھیرا ڈال دیا۔ایک پولیس افسر مولانا محمد علی کے نام یہ حکم نامہ لے کر پہنچا کہ طلبا کو ساتھ لے کر علی گڑھ کالج کی عمارت خالی کردیں۔بعدازاں طلبا کے اس قافلے نے کالج کی عمارت خالی کردی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں عمل میں آیا۔ اس ادارے کو قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی سرکار کی مداخلت سے تعلیم کا شعبہ آزاد ہو اور ایک ایسی تعلیمی درس گاہ وجود میں آئے جہاں مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس ضمن میں مولانا محمود حسن کا ایک خطبہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے فرمایا:

> مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد باعتبارِ عقائد وخیالات اور باعتبارِ اخلاق واعمال ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔ ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونی ورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا۔[۲]

جامعہ کے قیام کے بعد سرگرمیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اساتذہ اہم ذمہ داریوں پر مامور کیے گئے۔ بانیانِ جامعہ میں معتبر شخصیات کے ساتھ کئی سیاسی شخصیات بھی شامل تھیں۔ مولانا محمود حسن، مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی عظیم شخصیتوں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ وطن کی آزادی کے کچھ شیدائی بھی تھے، جنھوں نے جامعہ کے قیام میں جہاں تک ممکن ہوسکا مدد کی۔ انھیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

۱۹۲۴ء میں خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں ختم ہوگئیں۔ خلافت کمیٹی جامعہ کے اخراجات اٹھاتی تھی اس کے بند ہونے کے بعد جامعہ کو چلانا مشکل ہوگیا۔ ڈاکٹر انصاری نے ملک وقوم کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ اس وقت جامعہ کی یہ حالت تھی کہ کسی بھی وقت اسے بند کیا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر انصاری نے جامعہ جیسے تعلیمی ادارے کو قائم رکھنے کے لیے فنڈ جمع کرنے کی مہم شروع کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس وقت یوروپ میں تھے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ جامعہ کو بند کرنے کی تیاریاں ہورہی ہیں تو انھوں نے ایک خط کے ذریعے یقین دلایا کہ وہ اپنی زندگی جامعہ کے لیے وقف کردیں گے۔ اس لیے جامعہ کو بند نہ کیا جائے۔ مجلس امناء میں جامعہ کو قائم رکھنے کے مسئلے پر سخت بحث ہوئی اور آخرکار یہ طے پایا کہ ذاکر صاحب کے آنے تک جامعہ بند نہ کیا جائے۔ حکیم اجمل خاں نے مجلس امناء

سے جامعہ کو دہلی منتقل کرانے کی تجویز پاس کروائی اور پھر جامعہکو چلانے کی ذمہ داری اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ حکیم اجمل خاں کو گاندھی جی نے ہمت بندھائی اور کہا:

> آپ کو روپیہ کی دقت ہے تو میں بھیک مانگ لوں گا۔ حکیم صاحب فرماتے تھے کہ اس سے میری ہمت بندھی اور میں نے تہیہ کرلیا کہ جامعہ کو ہرگز بند نہ ہونے دیا جائے۔[۳]

جامعہ ملیہ اسلامیہ کو علی گڑھ سے دہلی ۱۹۲۵ء میں قرول باغ طبیہ کالج کے نزدیک کرایے کی چند کوٹھیوں میں منتقل کردیا گیا۔ علی گڑھ سے دہلی میں منتقلی کے وقت اس ادارے سے کئی افراد الگ ہوگئے۔ ان کا خیال تھا کہ جامعہ کو دہلی منتقل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے افراد بھی تھے جو سرے سے اس ادارے کو ختم کردینا چاہتے تھے مگر حکیم اجمل خاں جامعہ کے لیے ایک مسیحا ثابت ہوئے۔ انھوں نے مالی خرچ کی ذمہ داری اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

جامعہ کے لیے فروری ۱۹۲۶ء ایک خوش آیند سال تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین یورپ سے ہندوستان واپس آگئے اور اپنے ہمراہ دو ساتھیوں سید عابد حسین اور محمد مجیب کو بھی لائے۔ جامعہ میں ان کے آنے سے ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کو ۱۵ر مارچ ۱۹۲۶ء کو شیخ الجامعہ کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ پروفیسر محمد مجیب کو تاریخ وسیاسیات کا استاد مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کو رجسٹرار بنایا گیا۔ اب تک جامعہ کے مالی اخراجات حکیم اجمل خاں ہی اٹھاتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ کے سرپرستوں، ہمدردوں اور اساتذہ کی مدد سے چندہ جمع کرنے کا کام شروع کردیا۔ جون ۱۹۲۶ء میں وہ گاندھی جی سے ملنے سابرمتی آشرم گئے جہاں مختلف موضوعات پر گفت وشنید ہوئی۔ چندے سے متعلق بھی بات ہوئی۔ گاندھی جی نے جامعہ سے متعلق فرمایا:

> جامعہ کو مسلمانوں کے ایک ممتاز ادارے کی حیثیت سے قائم رکھنا ہے۔ انھوں نے یہ بات بہت زور دے کر کہی کہ اگر اس نام سے اسلامیہ کا لفظ ہٹا دیا گیا تو انھیں اس سے کوئی دل چسپی نہیں رہے گی۔[۴]

جامعہ کے ابتدائی دور کے معمار حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور عبدالمجید خواجہ تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۲۶ء تک جامعہ کی دیکھ بھال کی۔ جامعہ کے پہلے شیخ

الجامعہ محمد علی جوہر تھے۔ عبدالمجید خواجہ جامعہ کے دوسرے شیخ الجامعہ تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۱ء سے لے کر ۱۹۲۷ء تک جامعہ کو آگے بڑھانے میں خاصا اہم رول ادا کیا۔ عبدالمجید خواجہ نے جامعہ میں دو بڑے کام کیے۔ اول جامعہ پر شروع میں سیاسی رنگ غالب تھا انھوں نے اس رنگ کو ہلکا کر کے اسے خالص تعلیمی راستے پر ڈال دیا۔ دوم جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی لائے اس لیے انھوں نے خاصی مخالفتیں سہیں مگر اس مشکل کو نہایت دلیری کے ساتھ انجام دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر جامعہ پر سیاسی رنگ ہلکا نہ ہوتا اور جامعہ دہلی منتقل نہ ہوئی ہوتی تو سیاست کا رنگ بدلتے ہی اس کا وجود بھی قائم نہ رہتا۔ یہ چاروں معمار جامعہ کے قیام کے باعث اور اس کی بقا کی ضمانت ہیں۔

جامعہ کے ان معماروں نے مقاصد اور نصب العین 'تعلیمی آزادی' دینی اور دنیاوی علوم کی ہم آہنگی، اردو زبان میں تعلیم، وطن پرستی اور متحدہ قومیت، صنعت وحرفت، سادگی، کفایت شعاری اور میانہ روی وغیرہ کو قائم رکھا۔ ان معماروں نے ہنگامی اور عبوری دور میں بھی جامعہ کو بند ہونے نہیں دیا۔ جامعہ کے کاموں سے، بہت گہرا، اور دلی لگاؤ ہونے کی وجہ سے ان بہی خواہوں نے جامعہ کو قائم اور برقرار رکھا۔

جامعہ کا دوسرا دور فروری ۱۹۲۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین یورپ سے واپس آگئے تھے اور اپنے ساتھ اپنے دو ساتھیوں ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کو بھی ساتھ لائے تھے۔ ان لوگوں کی آمد سے جامعہ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں نے جامعہ کی تعمیر وترقی کے لیے بڑی تن دہی سے کام کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ ان کے دونوں ساتھیوں عابد صاحب اور مجیب صاحب نے جامعہ کے لیے کچھ ضروری اقدامات کرنے شروع کیے۔ ان لوگوں نے رضا کارانہ طور پر اپنی تنخواہوں میں خاصی کمی کی۔ ذاکر صاحب نے جب جامعہ کی باگ ڈور سنبھالی تو اس وقت انھیں طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوں کہ وسائل خاصے کم تھے۔ مگر انھوں نے اپنے مزاج کی نرمی اور اپنے شوق اور حقیقت شناسی سے ان سب کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے جامعہ کی تعلیمی فضا میں جدید معیار قائم کیے۔ وہ اپنے مضمون 'جامعہ کیا ہے؟' میں رقم طراز ہیں:

> قومی تعلیم کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں انسانی تہذیب کی بہترین صفات اپنے خاص رنگ میں پیدا کرے اور دوسرا کام یہ ہے کہ انھیں سوسائٹی کی خدمت کے لیے ہر قسم کے مفید پیشے سکھانے اور

روزی کمانے کے قابل بنائے۔[۵]

ڈاکٹر ذاکر حسین، عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب جامعہ کے وہ معماران ہیں جنھوں نے جامعہ کو نازک دور سے نکال کر اسے ترقی کی راہ پر ڈالا۔ انھوں نے جامعہ کے مقاصد اور اس کی خصوصیات کی تعبیر وتشریح اپنی تقریروں، مضامین اور تعلیمی منصوبوں کے ذریعے کی۔ بقول پروفیسر محمد مجیب:

> جامعہ ملیہ اسلامیہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ابتدائی اور ثانوی تعلیم، کالج اور اساتذہ کی تعلیم، سماجی تعلیم، ترقیاتی سرگرمیاں، تحقیق اور نشرو اشاعت کا کام یہ سب ایک دوسرے سے نہایت مربوط ہیں۔[۶]

۲۹ر اپریل ۱۹۲۸ء کو بورڈ آف ٹرسٹیز کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس میں ۳۰- اراکین شامل تھے۔ لہٰذا تمام حقوق واختیارات بورڈ آف ٹرسٹیز کو دے دیے گئے۔ ۱۹۲۸ء میں بھی جامعہ کو بند یا جاری رکھنے جیسے سوالات فضاؤں میں گشت کر رہے تھے کیوں کہ جامعہ پر ۵۵ ہزار روپے کا قرض تھا۔ وجہ یہ تھی کہ حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد جامعہ کو جو مالی مدد ملتی تھی وہ بند ہوگئی تھی، اس لیے اب یہ طے پایا کہ حکیم اجمل خاں کے نام ایک فنڈ جمع کیا جائے۔ لیکن اس کام میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ مجلس امناء بھی روپے کا انتظام نہ کرسکی۔ بہر حال جامعہ ملیہ کو اس کے کارکنوں کے سپرد کر دیا گیا۔ وہ نوجوان کارکن چوں کہ جامعہ کو برقرار رکھنا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے ایک نئی انجمن 'انجمن تعلیم ملی' بنائی۔ اس کے علاوہ اراکینِ جامعہ نے یہ بھی عہد کیا کہ وہ کم سے کم ۲۰ سال جامعہ کی خدمت کریں گے اور تنخواہ صرف ایک سو پچاس روپے ماہانہ لیں گے۔ ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، مولانا اسلم جے راج پوری، خواجہ عبدالحیٔ، حافظ محمد فیاض، ارشاد الحق، ماسٹر برکت علی، شفیق الرحمٰن قدوائی اور حامد علی وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ اساتذۂ جامعہ نے بھی اپنی تنخواہیں کم کرالیں تا کہ جامعہ کا خرچ کم ہوجائے۔ اگر یہ لوگ قربانی نہ دیتے تو جامعہ مالی بحران سے باہر نہیں نکل پاتی۔ ان بزرگوں نے غریبی اور مفلسی میں اپنی گزراوقات کی، مگر جامعہ کی عزت پر حرف نہ آنے دیا۔ ان کی قربانیاں رنگ لائیں۔ قوم وملت نے بھی اس ادارے کی جانب توجہ کی۔ اگر ان حالات میں سبھی ہمت ہار جاتے اور کوئی لائحۂ عمل تشکیل نہ دیتے تو جامعہ کا وجود ہی ختم ہوجاتا۔ سید عابد حسین اپنے مضمون 'مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ' میں ہندوستان

کی متحدہ قومیت کے احساس کی جانب توجہ دلاتے ہوئے کہتے ہیں:

> مسلمانوں کو اپنی تعلیم میں یہ تینوں پہلو شخصی، ملّی، قومی مدِ نظر رکھنے چاہئیں اور اپنے طلبا کو انسانِ کامل، سچا مسلمان اور پکا ہندوستانی بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔[۷]

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تیسرے دور کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب جامعہ قرول باغ سے اوکھلا منتقل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ادارے کے لیے مزید عمارتوں کی ضرورت تھی اس وجہ سے یکم اگست ۱۹۳۵ء کو شہرِ دہلی سے دور، ایک بہت ہی پُر فضا اور دل کش مقام پر جمنا کے کنارے بسا ہوا، ایک گاؤں اوکھلا کے نام سے مشہور تھا جہاں جامعہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ جامعہ کا وہ سفر جو علی گڑھ سے شروع ہوا تھا، وہ دہلی آکر اوکھلا میں مکمل ہو گیا اور ایک تعلیمی ادارے کی حیثیت سے اس کی پہچان بن گئی۔ جس کا طرزِ تعلیم بالکل مختلف تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس ضمن میں کہتے ہیں:

> ...مذہب کی تعلیم، فطرت کا مطالعہ اور انسانی زندگی کا مطالعہ – ایمان اور عقیدے اور عقل وفہم کی تربیت کے ساتھ ادب اور مصوری کے ذریعے سے تخیل اور جذبات کی تربیت اور دست کاری کے ذریعے سے ہاتھ اور نظر کی تربیت کی کوشش کی جاتی ہے۔ عملی، اخلاقی تربیت اور جسمانی تربیت میں مدرسے کے استاد، بورڈنگ ہاؤس کے اتالیق اور لڑکوں کے سرپرست مل کر کام کرتے ہیں۔[۸]

جامعہ ۱۹۳۹ء میں ایک سوسائٹی کی حیثیت سے رجسٹرڈ ہوئی تھی۔ اس کو ۱۹۶۲ء میں یو.جی.سی نے DEEMED یونی ورسٹی بنایا۔ لیکن جامعہ کو سینٹرل یونی ورسٹی کا درجہ نہیں دیا گیا۔ اس کے لیے بارہا کوششیں ہوئیں۔ آخر کار ۱۹۸۸ء میں جامعہ کو سینٹرل یونی ورسٹی کا درجہ مل گیا۔

جامعہ میں ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۸۸ء تک جو واقعات رونما ہوئے ان سب نے جامعہ کو مستحکم کرنے میں خاصا اہم رول ادا کیا۔ سینٹرل یونی ورسٹی کا درجہ ملنے سے قبل جامعہ کی توسیع اور استحکام کے لیے بانیانِ جامعہ کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، عبدالمجید خواجہ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری یہ ابتدائی دور خاصا آزمائشوں اور پریشانیوں کا دور تھا۔ ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۲۷ء تک

انھوں نے جامعہ کو قائم رکھنے کے لیے جدوجہد کی۔ خلافت کے خاتمے کے بعد حکیم اجمل خاں نے جامعہ کو بند نہ ہونے دیا اور اسے زمانے کی تیز وتند آندھیوں سے بچائے رکھا۔

ذاکر صاحب کو فلسفۂ تعلیم سے خاصی گہری دلچسپی تھی، جب وہ ہندوستان واپس آئے تو اپنے ہمراہ جرمنی سے نئے تعلیمی افکار و تجربات کو ساتھ لائے۔ انھوں نے کیرشن اشٹائنر (Kerschenstetiner)، رکرٹ (Rickert) ڈلتھائی (Dlithey) وغیرہ کی کتابوں کا مطالعہ بڑے ذوق وشوق سے کیا تھا۔ بقول پروفیسر محمد مجیب:

> ...ان کو ان مصنفین کے خیالات میں اس نظام کی ایک شکل دکھائی دی جس کا خاکہ اسلام، تمام سچی اور صحت مند ثقافتوں اور ایک اچھے معاشرے کے نصب العین میں ملتا ہے۔[۹]

ڈاکٹر ذاکر حسین جدید ذہن کے مالک تھے۔ وہ جرمنی سے جو جدید تعلیم حاصل کر کے آئے تھے اسے جامعہ میں بہت عمدگی سے نصاب میں شامل کر دیا گیا۔ وہ قدیم اور جدید دونوں طبقوں میں خاصے پسند کیے جاتے تھے۔ ضیاء الحسن فاروقی صاحب ذاکر کے کاموں سے متعلق لکھتے ہیں:

> ...بعد اس پر کڑا وقت تھا تو ذاکر صاحب نے اپنے ساتھی اساتذہ کی حوصلہ مندی کے سہارے ۱۹۲۸ء میں انجمن تعلیم ملی (بعد میں اس کا نام انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ ہو گیا) کی بنیاد ڈالی جس کے اراکین نے عمر بھر یا کم از کم بیس سال، جو مدت بھی کم ہو۔ ۱۵۰/روپے سے زیادہ تنخواہ نہ لے کر جامعہ کی خدمت کا عہد کیا۔[۱۰]

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں کی آمد سے تعمیر اور توسیع کے خاصے کام ہوئے۔ جامعہ کی ایک شاخ کو صدر بازار (دہلی) میں قائم کیا گیا جو رات کا مدرسہ تھا۔ اس مدرسے نے بعد میں بہت ترقی کی۔ بچوں کی ضرورتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ایک پرچہ پیامِ تعلیم، کے نام سے جاری کیا گیا۔ اس کا مقصد جامعہ کے کاموں سے لوگوں کو آگاہ کرنا اور طلبا کی تعداد کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ امداد فراہم کرنا بھی تھا۔ اپریل ۱۹۲۶ء میں سید عابد حسین کی زیرِ نگرانی یہ پرچہ شائع ہوا جو کہ پندرہ روزہ تھا۔

ذاکر صاحب تعلیمی کاموں میں خاصی دلچسپی لیتے تھے اور اس کے لیے وہ ایک ایسی ابتدائی تعلیم کے خواہاں تھے جس میں عملی کام کی تربیت بھی دی جائے اور طلبا آزادانہ طور پر اپنے کاموں کو کر بھی سکیں۔ تعلیم سے متعلق ان کی یہ رائے تھی:

> ذہن معروض اور ذہن موضوع میں مطابقت اور مناسبت کا خیال رکھنا تعلیم کا بنیادی گر ہے۔[۱۱]

ذاکر صاحب تعلیم کے ساتھ تربیت کے بھی قائل تھے۔ تعلیمی نظام میں ابتدائی تعلیم دراصل وہ بنیاد ہے جس پر تعلیم کی عمارت قائم کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد جان اسٹن کے الفاظ میں اس طرح ہے کہ تعلیم کا کام لوگوں کو ان باتوں کی تعلیم دینا ہے جنھیں وہ نہیں جانتے تعلیم کا مقصد ہے ان کو اس طرح کا برتاؤ کرنے کی تعلیم دینا جیسا کہ وہ نہیں کرتے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ابتدائی تعلیم سے متعلق بہت اچھی بات کہی ہے:

> ...اس منزل میں عملی کام کو تعلیم کا یعنی تربیت ذہنی کا وسیلہ اور اس کا مرکز بنایا جائے۔ اس منزل میں ذہن کی قوتوں کو بیدار کرنے میں ہاتھ کا کام کتاب سے زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔[۱۲]

ذاکر صاحب نے اپنے خطبات میں بھی جامعہ کے تعلیمی کاموں، حکومت کی امداد، جامعہ میں شعبوں کی توسیع سے متعلق اور مستقبل کے لائحۂ عمل کے تعلق سے خاصی بصیرت انگیز گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اپنے خطبے 'قومی تعلیم کے مسائل' (ایک مسلمان کی نظر سے) جو انھوں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں بطور خطبۂ صدارت ۱۲؍ مارچ ۱۹۵۲ء کو علی گڑھ میں پڑھا تھا۔ جامعہ کے کاموں سے متعلق اور اس کی توسیع کے لیے مزید مالی امداد کا مطالبہ اس طرح کیا ہے:

> ...حکومتِ ہند نے پچھلے دو سال میں ہماری خاصی امداد کی ہے۔ ہمارے انجینئرنگ کالج کی توسیع کے سلسلے میں چار لاکھ پینسٹھ ہزار روپے عمارت کے لیے اور دس لاکھ روپے سامان کے لیے منظور فرمائے ہیں۔ سائنس کی تعلیم میں توسیع کے لیے بھی ایک کثیر رقم دی ہے۔ مستقل سالانہ امداد جو تین لاکھ تھی اور چند دوسرے مقاصد کے لیے مقررہ امداد سے مل کر چھے یا

> ساڑھے چھے لاکھ ہوجاتی تھی، اس کے بجائے ساڑھے بارہ لاکھ کی مستقل امداد مقرر فرمائی ہے۔ ابھی ہمارے لڑکیوں کے کالج کی عمارت کی تکمیل کے لیے ایک لاکھ کی رقم منظور کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہماری مالی دشواریاں پوری طرح حل نہیں ہوئی ہیں اور توسیع کے بہت سے کام رُکے ہوئے ہیں خصوصاً زراعتی کالج اور میڈیکل کالج کے قیام کا معاملہ ابھی رُکا ہوا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ کام بھی شروع ہو ہی جائیں گے اور ہمیں حکومت سے ان کے لیے بھی مدد ملے گی۔ [۱۳]

ابتدائی تعلیم کے ضمن میں یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ ابتدائی تعلیم کی ترقی میں صرف خواندگی ہی مقصد نہیں ہوتا بلکہ تعلیم کا کام ایسے بچے تیار کرنا بھی ہوتا ہے جو ملک کا اچھا اور ذمہ دار شہری بنا سکے۔ جامعہ میں قومی تعلیم سے متعلق ذاکر صاحب نے اپنے مضمون میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کیا ہے؟ رقم طراز ہیں:

> ...قومی تعلیم کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں انسانی تہذیب کی بہترین صفات اپنے خاص رنگ میں پیدا کرے اور دوسرا کام یہ ہے کہ انھیں سوسائٹی کی خدمت کے لیے ہر قسم کے مفید پیشے سکھائے اور روزی کمانے کے قابل بنائے۔ [۱۴]

جامعہ ملیہ اسلامیہ جب علی گڑھ سے قرول باغ منتقل ہوئی تو اس کا رہائشی بندوبست ان کوٹھیوں میں کیا گیا تھا جس میں، مکتبہ جامعہ، ہمدردانِ جامعہ، تعلیم بالغان اور استادوں کا مدرسہ جیسے شعبوں کا قیام عمل میں آیا تھا۔

۱۹۳۳ء میں اوکھلا گاؤں میں جامعہ نے مستقل قیام کے لیے زمین خریدی۔ ۳۰راکتوبر ۱۹۳۳ء کو جامعہ کا ایک جشن منعقد ہوا، اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں جامعہ نگر میں اس کی دوسری عمارتوں کا سنگِ بنیاد بھی رکھا گیا۔ سب سے پہلے قرول باغ سے مدرسہ ابتدائی کو ایک نامکمل عمارت میں منتقل کیا گیا۔ رفتہ رفتہ سبھی شعبے جامعہ نگر میں منتقل ہوگئے صرف ایک اسکول تعلیمی مرکز نمبر۔۱، تعلیم بالغان کا شعبہ، مکتبہ جامعہ اور کتب خانہ ۱۹۴۱ء تک قرول باغ میں ہی رہے۔

۱۹۴۷ء کا سال ہندوستان کی تاریخ میں خاصا اہم ہے۔ ملک آزاد ہوا اور تقسیمِ ہند عمل میں آئی جس کی وجہ سے خاصی تباہی و بربادی ہوئی۔ اس کے بعد بقیہ ادارے بھی جامعہ نگر میں منتقل کر دیے گئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد جب فسادات کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں جامعہ کا تعلیمی مرکز بالکل ختم ہو گیا۔ یہ دور جامعہ کے لیے عبوری اور بحرانی دور تھا۔ اس بحرانی دور میں جامعہ کو خاصی مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۶۲ء میں جامعہ کو Deemed یونی ورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ اس طرح یو جی سی سے جامعہ کا براہِ راست تعلق قائم ہو گیا۔ جامعہ والوں کو مختلف شعبوں کے لیے یو جی سی سے مالی امداد بھی ملنی شروع ہو گئی۔ اس کے بعد جامعہ میں مختلف شعبے قائم ہوئے۔ مثلاً بالک ماتا سینٹر، جامعہ نرسری اسکول، انسٹی ٹیوٹ آف سول اینڈ رورل انجینئرنگ (رورل انسٹی ٹیوٹ) اور شعبۂ تاریخ میں ایم اے وغیرہ کے کورسیز قائم ہوئے۔ گرچہ جامعہ کی ترقی اور نشو و نما کی رفتار قدرے سست رہی مگر توسیع برابر ہوتی رہی۔

غلام حیدر جامعہ سے متعلق اپنی کتاب نقوشِ جامعہ، میں لکھتے ہیں:

> ...یہ ادارہ ایک سیاسی ہیجان کی پیداوار ضرور تھا، مگر بہت جلدی اسے ایک ترقی پسند آزاد قومی تعلیم و تربیت کی منفرد نہج کا ادارہ بنانے کی کوشش شروع کر دی گئی تھی، جس کی جھلک اس کے ہر ہر اقدام اور تحریک میں نظر آتی ہے۔ یہ ادارہ تعلیم کے ساتھ ذہن سازی، کردار سازی اور ایک گہرے قومی شعور کی نشو و نما کا ایک منصوبہ پیش نگاہ رکھ کر آگے بڑھایا جا رہا تھا۔[۱۵]

جامعہ نگر میں یکے بعد دیگرے شعبے منتقل ہوتے چلے گئے۔ حالانکہ سہولتیں زیادہ نہیں تھیں مگر سہولتوں کے کم ہونے سے بھی یہاں تعلیم و تربیت کا کام لگاتار جاری رہا۔ یہاں کے اساتذہ اور طلبا نے کسی بھی کام کے کرنے کو عار نہیں سمجھا۔ بجلی اور پینے کے پانی کی خاصی قلت تھی۔ ابتدا میں یہاں انھی سہولتوں کے فقدان کے باوجود جامعہ کے طلبا اور کارکنان کو خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان پریشانیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے بعد میں 'امورِ عامہ' کا شعبہ قائم کر کے ان دشواریوں کو فرو کرنے کا کام انجام دیا گیا۔ اس شعبے کے سپرد صفائی، جامعہ کے باغوں، نرسری کا انتظام، عام سامان کی حفاظت وغیرہ کے کام تھے جس کا ذکر نقوشِ جامعہ، میں غلام حیدر نے یوں کیا ہے:

> ...اس کے سپرد جامعہ کے علاقے میں لالٹینوں کے ذریعے روشنی، پختہ سڑکوں کی غیر موجودگی میں متعین راستوں کی صفائی، جامعہ کے باغات اور نرسری کا انتظام، عام سامان کی حفاظت اور جامعہ کی غیر آباد زمینوں کی دیکھ بھال وغیرہ کام شامل تھے۔ان کاموں میں جامعہ کے طالب علم اور اساتذہ رضا کارنہ طور پر شامل تھے کیوں کہ ملازم رکھنے کے لیے جامعہ کے پاس مالیت موجود نہیں تھی۔ [۱۶]

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا یہ تعلیمی سفر آہستہ آہستہ جاری رہا۔اس دوران کئی نئے شعبے بھی قائم ہوئے، جس میں اہم آرٹس انسٹی ٹیوٹ کا قیام تھا۔۱۹۴۳ء میں ابوالکلام صاحب نے آرٹس کے استادوں کے لیے چھے ہفتوں کا ایک ٹریننگ کورس شروع کیا۔اس کے بعد مختلف صوبوں کے لیے یہ کورس چلائے گئے جس میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔آرٹس کے استادوں کی تربیت کے مستقل انتظام سے متعلق غور وخوض کیا گیا۔ابوالکلام صاحب کو ٹریننگ کے لیے امریکہ بھیجا گیا۔انھوں نے وہاں سے واپس آکر ایک نو مہینے کے کورس کی ابتدا کی جو استادوں کے مدرسے کا ہی ایک حصہ تھا۔ استادوں کے اس مدرسے کی خاصی اہمیت تھی۔استادوں کے اس مدرسے میں جس میں معلموں کو ٹریننگ دی جاتی تھی، اسے قائم کرنے میں ذاکر صاحب نے خاصی جدوجہد کی تھی۔عبدالغفار مدھولی استادوں کے مدرسہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> کچھ عرصے سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اس فکر میں تھے کہ جامعہ میں استادوں کا مدرسہ (وہ مدرسہ جس میں یہ سکھایا جاتا ہے کہ بچوں کو لکھنے پڑھنے میں کس طرح ہوشیار بنانا چاہیے، قائم ہو) ادھر بعض اسلامی انجمنوں نے جو ابتدائی مدرسوں کو چلاتی ہیں اور دو ایک میونسپلٹیوں اور ڈسٹرک بورڈوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ جامعہ اپنے یہاں معلموں کی تعلیم کا مدرسہ کھولے۔خود جامعہ کے ابتدائی مدرسے سے ہر سال مدرس ٹریننگ کے لیے باہر بھیجے جایا کرتے تھے خیال ہوا کہ جامعہ خود ہی اس کام کو شروع کردے تو جامعہ کی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے استادوں کے لیے سہولت

ہو جائے گی۔[۱۷]

انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس ایجوکیشن بھی کچھ عرصے بعد قائم ہوگیا۔ مگر اس انسٹی ٹیوٹ کو مستحکم کرنے میں مالی دشواریوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ابوالکلام صاحب جو امریکہ سے ٹریننگ لے کر آئے تھے انھوں نے اس کی ترقی اور استحکام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انسٹی ٹیوٹ کو جو جگہ ملی تھی اس کے رکھ رکھاؤ میں ذاتی دلچسپی لی اور اس علاقے کو جامعہ کا خوب صورت علاقہ بنادیا گیا۔ آرٹس انسٹی ٹیوٹ نے روز بروز ترقی کے منازل طے کیے اور اس میں جدید ساز و مان اور طریقۂ تعلیم ہونے کی وجہ سے یہ ایک قابلِ قدر ادارہ بن گیا۔

جامعہ نے اپنے کارکنان، اساتذہ اور طلبا کے لیے نہ صرف تعلیمی سہولیات فراہم کیں بلکہ ان کے لیے روز مرّہ کی ضرورتوں اور اسٹیشنری وغیرہ کی چیزوں کو فراہم کرنے کے لیے بھی ایک 'اتحادی دکان' قائم کی جو علی گڑھ میں پہلے سے قائم تھی۔ اس میں طلبا اور اساتذہ رضا کارانہ طور پر کام کرتے تھے اس دکان کو کوآپریٹو کے اصولوں پر قائم کیا گیا تھا۔ روزانہ اس کے اسٹاک اور اخراجات کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا تھا۔ شام کو دن بھر کا حساب اتالیق کے سپرد کیا جاتا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں بچوں کا بینک بھی قائم کیا گیا، بینک کا پیسہ دکان میں بھی لگایا گیا اور اس کو بچوں کی دکان کا نام دیا گیا۔ جس کے بارے میں غلام حیدر لکھتے ہیں:

> جامعہ نگر کی زندگی میں طالب علموں کی لگ بھگ تمام ضروریات کو پورا کرنے والا یہی ادارہ تھا اس میں کام کرنے کے بعد طالب علم کو کاروباری امور کا نہ صرف مقصود پیدا ہو جاتا تھا بلکہ اتنا تجربہ بھی ہو جاتا تھا کہ بعد میں اگر ضرورت پڑے تو وہ پورے اصولی انداز میں دکان چلا سکتا تھا۔[۱۸]

اردو اکادمی علمی تصنیف و تالیف کا شعبہ تھا۔ اردو اکادمی کے کاموں میں سب سے اہم کام اعلیٰ معیاری تصانیف، تراجم اور تالیفات کو تلاش کرنا اور ان کی پوری چھان بین کے بعد انھیں چھپنے کے لیے مکتبہ جامعہ کے سپرد کرنا۔ دوسرا کام توسیعی لیکچرز کا انعقاد کرنا، مشاعرے اور اعلیٰ معیار کی ادبی و ثقافتی مجلسوں کو منظم کرنا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل کرنے کے بعد ملک جب پُر آشوب دور سے گزرا تو اس کا اثر لامحالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ پر بھی پڑا۔ یہاں بھی کچھ غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہوئیں جس کے نتیجے

میں اردو اکادمی آہستہ آہستہ مکتبہ جامعہ میں ضم ہوتی چلی گئی۔ اس کی سربراہی ورہنمائی ڈاکٹر سید عابد حسین نے کی۔

جامعہ میں تعلیم کے کاموں کو ایک مخصوص اہمیت حاصل تھی۔ یہاں کا طریقۂ تدریس عام اسکولوں سے قدرے مختلف تھا۔ یہاں کے نصاب میں کتابیں بہت کم تھیں، بالخصوص ثانوی درجات میں جیسے سائنس، حساب، جغرافیہ اور تاریخ۔ اس میں کوئی کتاب مختص نہیں تھی۔ نصاب میں محض ادب کی کتابیں تھیں جس کی اشاعت مکتبہ جامعہ کرتا تھا۔ تاریخ کے مضمون میں اساتذہ چند کتابوں کے مختلف ابواب پڑھنے کی ہدایت دیتے تھے۔ دوسرے یہاں پروجیکٹ طریقۂ تعلیم اور تفویضی طریقۂ تعلیم رائج تھا جس کی وجہ سے مضامین کے اساتذہ کو خاصی محنت کرنی پڑتی تھی۔

جامعہ کا طرزِ تعلیم مختلف نوعیت کا تھا، اس میں مقصدی یا پروجیکٹ میتھڈ سے پڑھانے میں خاصی دشواریاں پیش آتی تھیں۔ اس طرح کے طریقۂ کار سے پڑھانے کے لیے بہترین تربیت یافتہ اور مخلص استادوں کی ضرورت تھی تاکہ وہ مخصوص طریقہ کار سے طلبا کو پڑھا سکیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے عبدالغفار مدھولی کو ٹریننگ کے لیے پنجاب (موگا) کے ایک ماڈل ٹریننگ اسکول میں بھیجا گیا اس کے بعد ایک ایک کر کے پانچ استادوں نے تربیت حاصل کی۔ سعید انصاری صاحب کو پڑھنے پڑھانے کے طریقۂ کار کا مشاہدہ کرنے کے لیے شانتی نکیتن بھیجا گیا۔ ۱۹۳۸ء میں جامعہ میں استادوں کا مدرسہ قائم کیا گیا جس کا نصاب خواجہ غلام السیدین نے تیار کیا تھا۔ عبدالغفار مدھولی نے مدرسہ کا نظام الاوقات بنایا۔ ۱۹۳۷ء میں جب قومی بنیادی تعلیم منظور ہوگئی تو اس اسکیم کو بھی گاندھی جی کے کہنے پر ایک کمیٹی نے تیار کیا تھا جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ چنانچہ جامعہ کے استادوں کے مدرسے نے اسی تعلیم کو اختیار کر کے ابتدائی استادوں کے لیے تربیت کا آغاز کیا۔

استادوں کے مدرسے کا پہلا سال قرول باغ میں گزرا، اس وقت وہاں ذاکر صاحب، سعید انصاری، عبدالغفار مدھولی، ماسٹر عبدالحئی اور نور محمد صاحب اساتذہ تھے۔ ۱۹۳۸ء میں مجیب صاحب کی کوٹھی میں مدرسے کی کلاسیں بھی ہوتی تھیں۔

استادوں کا مدرسہ شروع سے ہی جامعہ کا ایک اہم شعبہ رہا ہے۔ اس مدرسے نے خاصی شہرت حاصل کی۔ اس ادارے کو ٹیچرس ٹریننگ کالج یا ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (ٹی ٹی آئی) نام دیے

گئے مگر اب یہ فیکلٹی آف ایجوکیشن کے نام سے مشہور ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس ٹریننگ کالج میں جو پہلے استادوں کا مدرسہ کے نام سے قائم ہوا تھا اس کے طریقۂ تعلیم میں جامعہ کے مقاصد نظر آتے ہیں۔ جامعہ کے مقاصد کو پچھلے اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین نے بھی تعلیم سے متعلق ایک جگہ لکھا ہے:

> تعلیم ایک طرح کا سفر ہے جس میں چاروں چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے: ا۔راہ رو ۲۔راہبر ۳۔منزلِ مقصود ۴۔راہ۔ راہ رو ظاہر ہے کہ کسی جماعت کی نئی نسل یعنی بچے ہوتے ہیں۔ راہبر جماعت کے وہ افراد ہوتے ہیں جو عمر اور ذہن کے لحاظ سے بالغ ہوں۔ منزلِ مقصود مراد ہے جماعت کے تعلیمی نصب العین سے جو اس کے تمدنی نصب العین کے تابع ہوتا ہے۔ راہ، عبارت ہے اس طریقۂ تعلیم سے جو مذکورہ نصب العین کو حقیقت کا جامہ پہنانے میں مدد دے۔ [19]

جامعہ میں تعلیم کے کاموں کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی یہاں پروجیکٹ طریقۂ تعلیم وتفویضی طریقۂ تعلیم خاصا اہم تھا۔ جس کے لیے یہاں کے بھی مضامین کے اساتذہ کو انتھک محنت کرنا پڑتی تھی۔ یہاں کا طرزِ تعلیم مختلف ہونے کی وجہ سے پروجیکٹ طریقۂ کار سے پڑھانے میں خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کیوں کہ اس طرح کے طریقۂ کار سے پڑھانے کے لیے بہترین تربیت یافتہ اساتذہ کی ضرورت تھی اور ان طریقوں سے پڑھانے کے لیے اساتذہ کو مخلص بھی ہونا چاہیے۔ بہرحال جامعہ میں اساتذہ کی تکنیکی تربیت کا انتظام نہیں تھا۔ اس وقت ہندوستان میں استادوں کی تربیت کے ادارے بہت زیادہ نہیں تھے، چنانچہ جامعہ میں اساتذہ کی تربیت کے لیے مواقع بھی فراہم کیے جاتے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ابتدائی درجوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی ان کا کہنا تھا:

> ...ملتِ اسلامی کی اصلاح وترقی کے لیے سب سے ضروری چیز چھوٹے بچوں کی تعلیم کا معقول انتظام آتا ہے یہی وہ بنیاد ہے جس پر قومی تعلیم کی بنیاد کھڑی کی جاسکتی ہے۔ [20]

مدرسہ ابتدائی کے کاموں کو کچھ اسکولوں اور تعلیمی انجمنوں نے دیکھ کر یہ محسوس کیا کہ جامعہ

استادوں کی تربیت کے لیے بھی ایک شعبہ کھولے۔لہٰذا، ۱۹۳۸ء میں جامعہ میں استادوں کی تربیت کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔

جامعہ میں جن کاموں کی جانب خاص توجہ دی گئی ان میں مدرسہ ابتدائی، بالغوں کی تعلیم، مکتبہ جامعہ اور اردو اکادمی وغیرہ تھے۔یہ چاروں ادارے ایک دوسرے سے باہم مربوط تھے۔مدرسہ ابتدائی کو اس لیے اولیت حاصل تھی کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی سطح پر طلبا کی ذہنی صلاحیتوں کی تربیت اور ان کی سیرت وشخصیت کی تعمیر اس طرز پر کی جاتی تھی کہ اس کی اہم بنیاد مدرسہ ابتدائی تھا۔ابتدائی تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے رسالہ پیامِ تعلیم، نے بھی خاصا اہم رول ادا کیا۔یہ رسالہ پندرہ روزہ اخبار کی شکل میں شائع ہوتا تھا۔اسکول کے بچوں کے پڑھنے کے لیے اس میں بہت اچھا مواد ہوتا تھا۔یہ رسالہ ابتدائی تعلیم کو بہتر بنانے کا ایک اچھا ذریعہ تھا۔مکتبہ جامعہ بھی ایک ایسا ہی ادارہ تھا جو جدید اصولِ تعلیم کے مطابق بچوں کے لیے درسی اور غیر درسی کتابیں تیار کرواتا تھا اور ان کی طباعت بہتر ہو اس کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی مصروفیت کے باوجود بچوں کے لیے کہانیاں، ڈرامے اور مضامین وغیرہ بھی لکھے۔انھوں نے جامعہ کے ابتدائی مدرسے اور بچوں کی ذہنی نشو ونما پر خاصی توجہ دی۔ذاکر صاحب کو بچوں سے خاصا لگاؤ و محبت تھی۔اس زمانے میں بچوں کے ادب کا بہت فقدان تھا۔بچوں کے لیے جو کتابیں چھپتی تھیں ان کا معیار اچھا نہیں ہوتا تھا۔اس کے علاوہ اندازِ بیان بھی پرانی طرز کا تھا۔انھوں نے جو کہانیاں لکھیں وہ اپنی مرحومہ بیٹی رقیہ ریحانہ کے قلمی نام سے لکھیں۔رقیہ دراصل ان کی چھوٹی بیٹی تھیں جن کا چار برس کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا جن سے ذاکر صاحب کو بے انتہا محبت تھی۔بعد ازاں یہ کہانیاں کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔جس کا عنوان ابو خاں کی بکری اور چودہ کہانیاں' رکھا گیا۔ اس کتاب کے انتساب میں انھوں نے لکھا ہے:

> یہ کہانیاں بہت دن ہوئے رقیہ ریحانہ کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔مجھے اُنھی نے سنائی تھیں اور یہ کہہ کر سنائی تھیں کہ کہیں پڑھی ہیں یا کسی سے سنی ہیں، مگر یاد نہیں؟ کب اور کہاں میں نے ان سے پائی تھیں اس لیے اُنھی کے نام سے پہلے شائع کیں۔پھر رقیہ ریحانہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئیں اور میں یہ نہیں پوچھ پایا کہ میں نے جس طرح ان کہانیوں کو لکھا ہے وہ

انھیں پسند بھی ہیں یا نہیں، لیکن لکھی چونکہ میرے ہاتھ سے گئی تھیں اور لوگ اسے جانتے ہیں اس لیے اپنے ہی نام سے شائع کرتا ہوں۔[۲۱]

جامعہ میں تعلیم بالغان کا کام بھی ضروری سمجھا گیا کیوں کہ ملک میں ناخواندہ بالغوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اس کا مقصد آزادی کی قدر و قیمت، جنگ آزادی کی اہمیت اور اپنے بچوں کو تعلیمی ضرورت کا احساس دلانا تھا۔ تعلیم بالغان میں خاصے تجربے کیے گئے حالانکہ سبھی کامیاب نہیں ہوئے مگر ایک مفید نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم بالغان کے مفہوم کو بہت وسیع سمجھا گیا جیسا کہ اب عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ جامعہ میں ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی جس میں بالغوں کی تعلیم سے متعلق تجربے کیے جائیں تاکہ تعلیم کی اس شاخ کے جدید اصول اور نظریوں کو جانچ کر اور اپنے تجربوں کے نتائج کو ملک میں اس طرح کے کام کرنے والوں تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں جامعہ میں ایک نیا شعبہ، ادارہ تعلیم وترقی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے روحِ رواں شفیق الرحمٰن قدوائی تھے۔ انھوں نے ذاکر صاحب کی مدد سے اس ادارے کو ایک ایسی منزل تک پہنچایا کہ جامعہ تعلیم کے اس میدان میں ایک رہنما ثابت ہوئی۔ ذاکر صاحب کی تعلیمی فکر کو عمل میں لانے اور تعلیم سے محروم لوگوں کو تعلیم پائے ہوئے لوگوں سے قریب لاکر سماجی زندگی کو بہتر بھی اسی ادارے نے بنایا۔

شعبہ تصنیف وتالیف کے نگراں ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ انھوں نے اس کی از سرِ نو تنظیم کی اور اس کا نام بدل کر اردو اکادمی رکھا۔ اردو اکادمی کے ناظم ڈاکٹر سید عابد حسین بنائے گئے پریس کا کام پروفیسر محمد مجیب کے سپرد کیا گیا۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے جرمنی میں باقاعدہ پرنٹنگ کا کام سیکھا تھا۔ مکتبہ جامعہ کے ذمہ دار حامد علی خاں مقرر ہوئے جن کی شخصیت خاصی متحرک تھی اور کاروبار کی سوجھ بوجھ بھی بہت تھی۔

اس کے علاوہ جامعہ ملیہ کے ترجمان رسالہ جامعہ کے معیار کو بہتر بنانے کا منصوبہ بھی تیار کیا گیا۔ یہ پرچہ ۱۹۲۳ء میں نورالرحمٰن صاحب کی ادارت میں جاری کیا گیا تھا۔ اردو اکادمی کی سرگرمیوں کو اعلا تعلیم کے طلبا کے لیے جو اردو زبان سے واقف تھے ان کے لیے مختلف موضوعات پر نصابی وعلمی کتابیں تیار کروانے کا ڈول ڈالا گیا۔ اس کے علاوہ ممتاز شخصیتوں کو مدعو کر کے توسیعی لکچرز کروانے کا ایک پروگرام بھی بنایا گیا جس سے نہ صرف جامعہ والے استفادہ کرسکیں بلکہ دہلی کے اہلِ علم اور

سربرآوردہ شخصیات بھی شرکت کرسکیں۔ مکتبہ جامعہ اور پریس نے اردو کتابوں کی اشاعت میں ایک معیار قائم کیا۔ رسالہ جامعہ نے بھی علمی وادبی حلقوں میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سب سے بڑی خاصیت یہ تھی کہ یہ اعلا تعلیم کے ادارے کی حیثیت سے غلامی کے دور میں وجود میں آئی لیکن نئی امیدوں اور تمناؤں کے ساتھ یہاں تعلیمی کام شروع کیے گئے۔ برطانوی حکومت کے نظامِ تعلیم کو یہاں کے نصاب میں اہمیت نہیں دی گئی۔ یہاں آزاد تعلیمی ادارے کی حیثیت سے تعلیمی کاموں کو جوش وخروش کے ساتھ شروع کیا گیا۔ حالانکہ یہ راہ خاصی کٹھن تھی جس کی وجہ سرمائے کی کمی اور محدود وسائل تھے۔ اس کے لیے جامعہ کے کارکنان نے خاصی جدوجہد کی اور اس کو قائم رکھنے کے لیے ہر قربانی پیش کی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے تعلیم کے اس سفر کو خاصی صعوبتوں کے باوجود بھی جاری رکھا۔ مدرسہ ابتدائی، مدرسہ ثانوی، استادوں کا مدرسہ میں تعلیم کے بھرپور تجربے کیے گئے۔ تعلیم بالغان کا شعبہ بھی کھولا گیا۔ علمی کتابوں کی تیاری، رسالہ جامعہ کی اشاعت اور اردو جیسے شعبے قائم کیے گیے تاکہ جامعہ کی ہمہ جہت ترقی ہوسکے۔ ان اداروں کو قائم رکھنا بھی ایک چیلنج تھا اس سلسلے میں وسائل کی کمی بہت بڑی رکاوٹ تھی لیکن پھر بھی اس کام کو انجام دیا گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ملک کے علمی حلقوں میں جامعہ نے ایک اعلا تعلیمی ادارے کی حیثیت سے اہم مقام حاصل کرلیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی انفرادیت یہ بھی تھی کہ وہ علم کو پھیلانے اور تعلیم کے رشتے کو تہذیب وتمدن سے ہم آہنگ کرنے میں دوسری یونی ورسٹیوں سے خاصا ممتاز ہے۔ جامعہ کے تعلیمی سال ۴۴-۱۹۴۳ء میں عید کے موقع پر بچوں کے تعلیمی میلے کی لیکچرز سیریز کے دوران ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایک تقریر کی جس میں انھوں نے کہا:

> یہ بے شک ابھی ایک چھوٹی سی اور کمزور سی تعلیم گاہ ہے لیکن اس کے حوصلہ کو پست نہ ہونے دو۔ یہ ہماری قومی زندگی کی تاریکی میں امید کی ایک کرن، اپنی محنت اور محبت، اپنے استقلال اور اپنی ہمت سے اسے آفتاب بنادو، جو زندگی کے سب شعبوں میں ہمیں روشنی بھی دے اور گرمی بھی۔ اسے اس ملک میں مسلمانوں کی حیثیت کا ترجمان بنادو یعنی اپنی باعزت زندگی اور سربلندی کا ترجمان بنادو۔[۲۲]

جامعہ ملیہ اسلامیہ علمی اور تعلیمی درس گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تربیت گاہ کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ یہاں دین و دنیا دونوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جامعہ میں تعلیمی تجربات خوب ہوئے ان تجربوں میں ایسے افراد بھی موجود ہوتے تھے جو تعلیم کی سبھی منزلوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ یہ جامعہ کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے بانیان اس کو اعلیٰ تعلیم کا ادارہ بنانے کے خواہش مند تھے۔ چناں چہ ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم، کالج، اساتذہ کی تعلیم، سماجی تعلیم، تحقیق اور نشرو اشاعت کے کاموں پر خصوصی توجہ دی گئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جامعہ سے متعلق ایک جگہ رقم طراز ہیں:

> ...اسی طرح جامعہ کی تربیت کا اصول یہ ہے کہ لڑکوں میں اخلاقی آزادی اور ذمے داری کا احساس پیدا ہو وہ اپنے آپ کو ایک برادری کا رکن سمجھیں اور جہاں تک ہو سکے اس کی خدمت کا بوجھ اٹھائیں تاکہ انھیں خود ہی قانون اور قاعدے کی ضرورت اور اس کی پابندی کی مصلحت محسوس ہو اور استاد کو جبر کرنا یا سزا نہ دینا پڑے۔[۲۳]

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے تعلیمی کاز کو مکمل کرنے کے لیے بہت سے ادارے اور شعبے قائم کیے۔ یہ ادارے خاصے فعال ہونے کے باوجود ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ رسالہ 'جامعہ' ان میں سب سے اہم ہے۔ یہ جامعہ کی تعلیمی سرگرمیوں اور سماجی افکار کا ترجمان تھا۔ رسالہ 'جامعہ' نے علمی پسماندگی سے متعلق قارئین کو احساس دلانے اور ان میں بیداری پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس میں ادبی مضامین کے علاوہ تعلیم، نصابِ تعلیم اور تعلیمی نظام سے متعلق مضامین بھی شائع کیے جاتے تھے۔ ابتدا میں شعبۂ تصنیف و تالیف کے تحت رسالہ 'جامعہ' شائع کیا جاتا تھا۔

ہندوستان کی آزادی اور تقسیم ہند کے بعد رسالہ 'جامعہ' کو بھی خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ فرقہ وارانہ فسادات میں تباہ و برباد ہو گیا، جس کی وجہ سے رسالہ جامعہ، اگست ۱۹۴۷ء سے اکتوبر ۱۹۶۰ء تک بند رہا۔ نومبر ۱۹۶۰ء میں پروفیسر محمد مجیب کی کوششوں سے دوبارہ اشاعت پذیر ہوا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کو گاندھی جی ہندو مسلم اتحاد کا ایک بڑا مرکز سمجھتے تھے۔ وہ ہمیشہ جامعہ کے روشن مستقبل کے خواہاں تھے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کسی نہ کسی موقعے پر تشریف لاتے تھے۔ انھوں نے ذاکر صاحب کو جامعہ کی عمارتوں کے سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب کے موقع پر ایک خط لکھا تھا جس میں

انھوں نے جامعہ کے بارے میں لکھا تھا:

> یہ ایک عظیم خیال ہے کہ جامعہ کی عمارتوں کا سنگِ بنیاد ایک بچے کے ہاتھوں رکھا جائے۔ میں اس خیال کے انوکھے پن پر تم کو مبارک باد دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے جامعہ کا مستقبل روشن ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کا ایک بڑا اور چھتنا ور درخت بن جائے گا۔[۲۴]

گاندھی جی نے ۲۳؍اکتوبر ۱۹۳۷ء کو واردھا میں نئی تعلیم سے متعلق ذاکر صاحب کی تجاویز پر غور وخوض کرتے ہوئے جو دیہی علاقوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم اور خود کفیل تعلیم سے متعلق تھیں ایک آل انڈیا نیشنل ایجوکیشن کانفرنس منعقد کی جس میں تعلیم کے ماہرین بھی شریک ہوئے۔ ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے۔ گاندھی جی نے اس ایجوکیشن کانفرنس میں افتتاحی تقریر کی جس میں انھوں نے اپنے تعلیمی خیالات کی وضاحت کی کہ پرائمری مڈل اور ہائی اسکول کی سطح تک تعلیم کا ایسا نظام ہو جس میں ایک حرفے کی تعلیم ضرور شامل ہو۔ ابتدائی تعلیم کے لیے جو چار برس کی مدت رکھی گئی وہ بہت کم ہے اسے بڑھا کر سات برس کر دینا چاہیے۔ اس کے علاوہ ابتدائی تعلیم میں ثانوی تعلیم شامل کر کے پوری مدت کے لیے ایک مربوط نصاب بنایا جائے کہ یہاں سے فارغ التحصیل طلبا کی معلومات اتنی ہوں جتنی کہ اس وقت میٹریکولیشن کے لیے درکار ہیں۔ مگر علم کو محض کتاب کے ذریعے نہ سکھایا جائے بلکہ کسی دست کاری/حرفے کو نصاب کا مرکز بنایا جائے اور بقیہ سبھی مضامین اسی کے ضمن میں پڑھائے جائیں۔ انھوں نے دیہاتی دست کاروں کی ابتری کا ذکر بھی کیا۔ ہندوستان کے دیہاتوں میں دست کاریاں اور بہت سی صنعتیں انتہائی خستہ حالت میں موجود ہیں، چنانچہ ان دست کاریوں میں تعلیم دی جاسکتی ہے۔ انھوں نے تکلی اور چرخہ کے ذریعے کو مرکز بنا کر تاریخ، معاشیات، ریاضی، جغرافیہ کے علم آسانی سے سکھائے جاسکتے ہیں۔ گاندھی جی نے اپنی اسکیم کے ضمن میں کہا کہ جو مدرسے کھولے جائیں وہ اپنا خرچ خود براشت کریں۔

وردھا کے راشٹریہ شکشا سملین میں گاندھی جی کے خیالات کی روشنی میں ڈاکٹر ذاکر حسین کمیٹی کی مندرجہ ذیل تجاویز کو منظور کیا گیا تھا جو اس طرح تھیں:

> ا۔ اس کانفرنس کی رائے ہے کہ پورے ملک میں سات سال تک کی تعلیم

مفت اور لازمی تعلیم کے طور پر رائج کی جائے۔

۲۔اس کا ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو۔

۳۔یہ کانفرنس مہاتما گاندھی کی تجویز کی تائید کرتی ہے کہ اس پوری مدت میں تعلیم کا محور کسی نہ کسی شکل میں ہاتھ کا نفع بخش کام ہونا چاہیے اور دوسری تمام استعدادوں کی نشوونما یا تربیت دینے کا سب کام، جہاں تک ممکن ہو کسی ایسے خاص حرفے سے مربوط ہو جسے بچے کے ماحول کے مطابق منتخب کیا گیا ہو۔

۴۔کانفرنس کو یہ تسلیم ہے کہ یہ نظامِ تعلیم رفتہ رفتہ اس قابل ہو جائے گا کہ استادوں کی تنخواہوں کا خرچ خود نکال لے۔[۲۵]

بنیادی قومی تعلیم کی تجویز میں یہ قرار پایا کہ بنیادی حرفے کو مرکز قرار دے کر اور دوسرے حرفوں کی مدد سے تمام مضامین کی تعلیم دی جاسکتی ہے۔ بچے دماغ اور ہاتھ دونوں سے کام کرنا پسند کرتے ہیں۔اس ضمن میں جامعہ کے مدرسہ ابتدائی میں خاصے کام ہوئے۔ یہاں کے اساتذہ نے خاصی محنت کی اور پروجیکٹ میتھڈ کے ذریعے طلبا کو تعلیم دینے کا کام کیا۔ جامعہ کے مدرسہ ابتدائی میں طریقہ الصوت، کہانی کا طریقہ اور بنیادی حرفہ کا طریقہ وغیرہ تدریس میں استعمال کیا جاتا تھا۔عبدالغفار مدھولی نے ایک قاعدہ مرتب کیا اور یہ بتایا:

> بنیادی حرفے کے ذریعے تعلیم دینے کے لیے ایسی جماعتوں کے لیے تو مواد مل جاتا ہے جہاں بچے لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف ہو جاتے ہیں ان بچوں کے لیے ہے جو کچھ جانتے ہی نہیں ہیں۔ان باتوں کو سامنے رکھ کر میں نے حرفہ کا قاعدہ تیار کیا ہے جو ہے تو کہانی کا طریقہ اور طریقہ الصوت کے اہم اصولوں پر لیکن تمام تر مواد حرفہ سے تعلق رکھتا ہے۔اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ابتدا ہی سے، بچہ جو کچھ کرے وہ پڑھ سکے اور جو کچھ پڑھے وہ کر سکے۔[۲۶]

عبدالغفار مدھولی نے جو قاعدہ مرتب کیا وہ ان بچوں کے لیے تھا جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے

تھے انھوں نے ان کے لیے حرفے پرمبنی مواد کو فراہم کرنے میں خاصی محنت کی۔ قاعدہ کے طریقۂ تعلیم سے متعلق وہ فرماتے ہیں:

> جہاں تک طریقۂ تعلیم کا تعلق ہے وہ سب کے سب کہانی کا طریقہ اور طریقہ الصوت پر ہے فرق صرف مواد کا ہے یعنی کہانی کے طریقہ میں کہانی کو بنیاد قرار دیا ہے اور اس قاعدہ میں حرفہ سے متعلق کام کو اس کا نام رکھا ہے 'حرفہ کا قاعدہ' پڑھنے سے پہلے اس کی تربیت حاصل کرنا ضروری ہے۔[۲۷]

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تاریخی اور تعلیمی سفر نے ایک سو سال مکمل کر لیے ہیں۔ ان سو برسوں میں جامعہ نے چاہے وہ تعلیمی ہو یا تاریخی، وسماجی ہر اعتبار سے اپنی شناخت کو برقرار رکھا ہے۔

حواشی

۱۔ ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک ——شمس الرحمٰن محسنی، ص:۱۰
۲۔ شہیدِ جستجو —— ضیاء الحسن فاروقی، ص:۹۳
۳۔ جامعہ کی کہانی ——عبدالغفار مدھولی، ص:۷۰
۴۔ ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک ——شمس الرحمٰن محسنی، ص:۵۲-۵۱
۵۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک، تاریخ اور روایت [جلد اول] ص:۲۳
۶۔ ایضاً، ص:۱۹۲
۷۔ ایضاً، ص:۱۰۲
۸۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک، تاریخ اور روایت [جلد اول] ص:۳۴
۹۔ ایضاً، ص:۳۵
۱۰۔ ذاکر صاحب اپنے آئینہ ولفظ ومعنی میں/ مرتب: ضیاء الحسن فاروقی، ص:۸
۱۱۔ ایضاً، ص:۱۴۲
۱۲۔ ایضاً، ص:۱۴۲
۱۳۔ ایضاً، ص:۱۵۳
۱۴۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک، تاریخ اور روایت [جلد اول] ص:۳۲،
۱۵۔ نقوشِ جامعہ —— غلام حیدر، ص:۱۰۴

۱۶۔ ایضاً،ص:۱۰۷
۱۷۔ ایک معلم کی زندگی[حصہ دوم]——عبدالغفار مدھولی،ص:۴۹
۱۸۔ نقوشِ جامعہ——غلام حیدر،ص:۱۱۰
۱۹۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک،تاریخ اور روایت[جلد اول]ص:۱۰۱
۲۰۔ نقوش جامعہ——غلام حیدر
۲۱۔ شہیدِ جستجو——ضیاءالحسن فاروقی،ص:۲۴۵-۲۴۴
۲۲۔ ایضاً،ص:۵۲-۵۱
۲۳۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک،تاریخ اور روایت[جلد اول] ص:۳۵
۲۴ شہیدِ جستجو——ضیاءالحسن فاروقی،ص:۳۰۵
۲۵ ایجوکیشن ری کنسٹرکشن،ص:۹۰-۶۸
۲۶۔ ایک معلم کی زندگی[حصہ دوم]——عبدالغفار مدھولی،ص:۵۵-۳۵۴
۲۷ ایضاً،ص:۳۵۵

[بشکریہ:رسالہ جامعہ،جلد:۱۱۸،شمارہ:۱۰،۱۱،۱۲/اکتوبر-دسمبر۲۰۲۱ء]

ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی *

جامعہ ملیہ اسلامیہ
سفر ایک صدی کا

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جامع مسجد میں ۲۹؍اکتوبر ۱۹۲۰ء کو بعد نماز جمعہ عمل میں آیا۔ عظیم مجاہد آزادی، اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسن نے ایک اعلان کے ذریعہ اس کی تاسیس کی۔ جن سرفروشوں نے اس ادارے کے قیام کے لیے جدوجہد کی ان کے پاس نہ سرمایہ تھا، نہ زمین تھی، نہ وسائل تھے، نہ اصحاب ثروت کی سرپرستی حاصل تھی۔ ان کا سرمایہ صرف بے سروسامانی تھا۔ ان کی دولت قناعت اور ان کے وسائل خدا پر بھروسہ تھا۔

۲۹؍اکتوبر کو جامعہ کے قیام کا اعلان تو ہوگیا تھا، لیکن نہ کلاسیں شروع ہوئیں، نہ اساتذہ مقرر ہوئے۔ نہ کوئی جگہ تھی نہ کوئی ٹھکانہ۔ بس ایک اعلان ہوگیا تھا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آگیا ہے، اس کے بعد وہ جلسہ منتشر ہوگیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اعلان بھی ہوا میں گم ہوجاتا لیکن مرد مجاہد کی آواز میں اللہ نے ایسی قوت رکھی کہ تمام نامساعد حالات کے باوجود جامعہ قائم ہوگئی اور آج ایک صدی سے زیادہ کا سفر طے کرچکی ہے۔ اس کی سبیل یہ بنی کہ اگلے دن پرنسپل کے کہنے پر برطانوی پولس نے ان طلبہ کو بورڈنگ سے نکال دیا جنھوں نے اعلان تاسیس کے اس جلسہ میں شرکت کی تھی۔ طلبہ اس ناگہانی

* ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ای میل: mmushtak@jmi.ac.in

افتاد سے پریشان ہو گئے، اگر چہ ان کے حوصلے جوان تھے لیکن تھے تو نوجوان ہی۔ کوئی راہ عمل متعین نہ کر سکے اور جامعہ کے بانی اور تحریک جامعہ کے اولین نقیب مولانا محمد علی جوہر کے پاس گئے۔ انھوں نے طلبہ کی رہنمائی کی اور اس طرح ان طلبا کو ایک قیادت مل گئی۔

تعلیم کو سامراجی قوتوں کے دباؤ سے آزاد کرنے والے یہ تمام طلبہ جو تعداد میں تقریباً سوا سو تھے، حالات کی سنگینیوں کے سائے میں اپنے کمروں سے نکالے گئے۔ عبدالمجید خواجہ نے اپنے ایک وکیل دوست کا مکان جو کرشنا کوٹھی کہلاتا تھا، فوری طور پر کرایہ پر لیا اور اس کے چند کمروں میں آزادی کے یہ متوالے فروکش ہو گئے۔ علی گڑھ کے جو ملازمین ان کے ساتھ تھے، انھوں نے انتظامی امور سنبھالے۔ اس طرح مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں یہ قافلہ کرشنا کوٹھی میں فروکش ہوا، کمروں کی صفائی اور پائین باغ کے جھاڑ جھنکار کو صاف کر کے تعلیم و تدریس کا ماحول بنایا، ادھر یہ اپنا کام کر رہے تھے ادھر دست قدرت کی صناعی جاری تھی۔ ان طلبہ کے اخراج کی خبر شہر میں پہنچ گئی اور شہر کے لوگوں نے عمدہ قسم کے کھانے تیار کیے اور دوپہر ہوتے ہوتے کرشنا کوٹھی پر پہنچ گئے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے آغاز سفر کا یہ پہلا دن تھا۔ جن کے سامراج میں سورج نہیں ڈوبتا تھا انھوں نے چند طلبہ سے چھت چھین لی، ان کے پاس جو سر و سامان تھا وہ بھی چھن گیا اور محض توکل علی اللہ کے سہارے وہ اپنے کام میں لگ گئے۔ دن بھر کی مصیبتوں کے تھکے ہارے رئیس گھرانوں کے یہ بچے تھکن سے نڈھال ہو کر ننگے فرش پر سو گئے۔ مولانا محمد علی جوہر بھی انہی کے ساتھ رہے۔ اگلے دن سے تعلیم کا آغاز ہو گیا۔ مولانا محمد علی جوہر انگریزی ادب اور اسلامیات کے استاد بنے، اردو و فارسی کی تدریس کے لیے سید شرف الدین آگئے، دیگر موضوعات کے لیے اونچے درجہ کے طلبہ نے نیچے درجے کے طلبہ کی تدریس شروع کر دی۔ چند دن کے بعد خواجہ عبدالحئیٰ تشریف لائے اور انھوں نے کرشنا کوٹھی کے ایک فرش پر تفسیر کا درس شروع کر دیا۔ اس طرح نہایت بے سروسامانی میں درس و تدریس کا یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔

جامعہ کی تاسیس کی خبر عام ہوئی تو مختلف علاقوں سے طلبہ کی بڑی تعداد اس قومی تعلیمی جامعہ میں پڑھنے کے لیے آگئی۔ حتیٰ کہ کرشنا کوٹھی کی جگہ بہت تنگ ہو گئی۔ ایسے میں میرٹھ کے اصحاب خیر نے خود علی گڑھ آ کر طلبہ کے لیے خیمے لگا دیے اور خیموں کی اس بستی میں تعلیم کی آزادی کے سپاہی استعماری

طاقتوں اوران کے وسائل کا مقابلہ کرنے کی تیاری کرنے لگے۔

تاریخ انسانی پر نظر ڈالیے اور خاص طور سے تعلیم کی تاریخ دیکھے، اس بے سروسامانی کی مثال کوئی دوسری نہیں ملے گی۔ اس ایثار وقربانی کا جذبہ کہیں اور نظر نہ آئے گا۔ کچھ دیوانے اٹھے اور انھوں نے اپنی ناطاقتی کے بل پر اس سامراج کو چیلنج کیا جس کی قلمرو میں کبھی آفتاب غروب نہ ہوتا تھا۔ یہ سب لوگ محنت کش مزدور نہیں تھے، زیادہ تر لوگ ناز پروردہ اور عیش وتنعم کے دلدادہ تھے۔ غم اور پریشانی کی پرچھائیاں شاذ ونادر ہی ان کے دروازوں کی طرف نظر اٹھا پاتی تھی۔ لیکن آزادی کے جذبہ نے ان کے اندر ایسی چنگاری پھونک دی تھی کہ انھوں نے اس بے سروسامانی میں رہنا گوارہ کیا اور ہر قسم کے عیش و آرام کو تج دیا۔

مہاتما گاندھی کو اطلاع دی گئی کہ ہم نے تعلیم کے میدان میں ترک موالات شروع کردی ہے تو انھوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور اپنے آپ کو تادم زیست جامعہ سے وابستہ کرلیا۔ جامعہ کی دہلی منتقلی کے بعد اپنے بیٹے دیوداس کو جامعہ میں استاد مقرر کیا اور اپنے پوتے رسک لال کو جامعہ میں داخل کرایا۔ خود بھی جب دہلی آتے تو جامعہ ضرور آتے۔ متعدد مرتبہ جامعہ آئے۔ طلبہ سے باتیں کیں۔ ان کو مشورے دیے۔ مہاتما گاندھی کو جامعہ کی اتنی فکر تھی کہ جب تقسیم ملک کے ہنگاموں میں مہاتما دہلی آئے تو اسٹیشن پر ہی ذاکر صاحب اور جامعہ کی خیریت دریافت کی اور مزید اطمینان کے لیے ۹ رستمبر ۱۹۴۷ء کو خود جامعہ آئے۔

جامعہ کا قیام تو تحریک ترک موالات کے زیراثر ہوگیا لیکن اس کے اخراجات خلافت کمیٹی اٹھا رہی تھی۔ خلافت کمیٹی کا اثر جیسے جیسے کم ہونا شروع ہوا ویسے ویسے جامعہ کی مالی مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر حکیم اجمل خاں کے مشورے پر جامعہ کو ۱۹۲۴ء میں قرول باغ (دہلی) منتقل کیا گیا اور پھر ۱۹۳۵ء میں وہ موجودہ مقام پر آکر سکونت پذیر ہوا۔

جامعہ اول دن سے ایک تحریک تھی۔ آزادی کے متوالوں کا ایک کارواں تھا۔ جامعہ کی اساس ہندو مسلم اتحاد پر استوار ہوئی تھی۔ گاندھی جی کی تحریک نے جامعہ کو ایک رخ دیا تھا۔ گاندھی نے متعدد مرتبہ کہا کہ اس ادارے کے قیام میں میرا بھی حصہ ہے اور جامعہ برادری بھی گاندھی جی کو ہمیشہ اپنا سرپرست سمجھتی رہی۔ جامعہ میں کبھی بھی ہندو مسلم کا سوال نہیں اٹھا۔ جامعہ کے بانی تو مولانا

محمد علی جوہر تھے لیکن اس کے سرپرستوں میں جس طرح حکیم اجمل خاں، عبدالمجید خواجہ اور ڈاکٹر مختار انصاری وغیرہ تھے اسی طرح مہاتما گاندھی اور جمنا لال بجاج بھی تھے۔ جامعہ کے دروازے پر طالب علموں کا استقبال مذہب پوچھ کر نہیں ہوتا تھا۔ یہاں گاندھی جی کے دوست احمد محمد کے پوتے بھی پڑھتے تھے، اسی طرح خود گاندھی جی کا پوتا رسک لال پڑھتا تھا۔ جامعہ میں مسلمان بچوں کی دینی تربیت کے لیے اول دن سے اسلامیات کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تھا، اسی طرح جب جامعہ کے لوگوں نے ہندو بچوں کی مذہبی تربیت کے لیے ہندو مذہب کی تعلیم کا آغاز کیا تو گاندھی جی نے یہ تجویز رکھی جب تک جامعہ خود کفیل نہیں ہو جاتی اس وقت تک ہندو مذہب کے استاد کی تنخواہ برادران وطن دیں گے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ایسا ادارہ ہے جہاں تعلیم وتدریس کو عبادت سمجھا جاتا ہے، جہاں بے شمار اساتذہ نے صرف تعلیم دی، کبھی تنخواہ نہیں لی، اور ایسے بھی بہت سے واقعات ہیں جب حالات کی گرانی کو دیکھ کر اساتذہ نے خود ہی اپنی تنخواہیں کم کر دیں۔ حتیٰ کہ جامعہ کے وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب کی تنخواہ اتنی کم ہو گئی کہ ان کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے۔ اور مہاتما گاندھی نے مجیب صاحب کے والد محمد نسیم سے کہہ کر ان کے اخراجات کے لیے اضافی رقم دلوائی۔

جامعہ ہندوستان کی سیکولر روایات کی امین ہے۔ جامعہ کے اساتذہ نے ہمیشہ وطن دوستی اور ہندو مسلم اتحاد کا سبق دیا۔ ہمارا ملک ایک مذہبی معاشرہ کا حامل ہے اور مختلف مذاہب کے ماننے والے اپنے اپنے مذہب پر عمل پیرا ہوتے ہوئے دوسرے کے مذاہب کا احترام کرتے ہیں۔ یہاں روح القرآن لکھنے والے پنڈت ونوبا بھاوے ہیں تو مہابھارت کا فارسی ترجمہ کرنے والے ملا عبدالقادر بدایونی بھی ہیں۔ یہی اس ملک کی مستقل روایت ہے اور جامعہ اس روایت کی امین ہے۔ پورے ملک میں شاید ہی کوئی دوسرا تعلیمی ادارہ ہو جہاں ہر شعبہ کے طلبہ کے لیے مذہبی تعلیم لازمی ہو اور ہر مذہب کی تعلیم دی جاتی ہو۔ جامعہ میں انجینئرنگ اور سائنس فیکلٹی کو چھوڑ کر ہر فیکلٹی میں اسلام، ہندو مذہب، جین مذہب، بدھ مذہب، سکھ مذہب اور عیسائیت کی تعلیم دی جاتی ہے اور ان میں بھی طلبہ کو اختیار ہوتا ہے کہ چاہے جس مذہب کی تعلیم حاصل کریں۔ مذاہب کی تعلیم کا ایک مقصد یہ ہے کہ طلبہ اپنے مذہب سے واقف ہوں تاکہ مذہبی بنیں اور دوسرے کے مذہب سے بھی واقف ہوں تاکہ روادار بنیں۔ جامعہ

کی یہ روایت روز اول سے قائم ہے۔ بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنے اسلامی کردار کے ساتھ ہندوستان کی کثیر مذہبی روایات کا امین اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کی رگ جاں ہے۔اس کا خمیر ہندوستانی تمدنی روایات سے عبارت ہے۔ یہاں کے اساتذہ اسی کی تعلیم دیتے ہیں اور طلبہ کی تربیت اس طرح کرتے ہیں کہ وہ بہترین اسکالر بننے کے ساتھ خود مذہبی بھی ہوں اور مذہبی طور پر روادار بھی ہوں۔

جامعہ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں تعلیم غایت ومقصد نہیں ہے۔ بلکہ اصل غایت اور مقصد طلبہ کی تربیت ہے، یہاں تعلیم برائے تعمیر شخصیت ہے۔اس لیے یہاں اساتذہ کے لبوں کی مشفقانہ مسکراہٹ پندار علم کی تنک مزاجی سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کہا کرتے تھے کہ استاذ کی پیشانی پر محبت کا عنوان رقم ہونا چاہیے۔اس لیے یہاں اساتذہ میں روایتی طور پر یہ معمول رہا ہے کہ ان کے لیے پوری جامعہ درسگاہ رہی ہے۔ کلاس روم ایک انتظام ہے لیکن اصلاً پورا جامعہ کا احاطہ ہی کلاس روم ہوتا ہے۔ یہاں اساتذہ چلتے پھرتے بھی اپنے طلبہ کو فیض یاب کرتے رہے ہیں۔ جامعہ کی اولین کلاس کرشنا کوٹھی کے صحن میں درخت کے نیچے شروع ہوئی تھی، وہ روایت کم از کم پچھلی نسل تک یہاں بھی باقی رہی۔ استاد چمن میں ہے، طلبہ آ گئے تو چمن کے درختوں کے نام اوران کی خوبیاں بتانی شروع کر دیں۔ استاد راستہ میں ہے، طلبہ ساتھ ہو لیے تو ادب اور تاریخ کے جواہر پاروں کی پھلجھڑی لگ گئی۔

جامعہ کے پرانے طالب علم بتاتے ہیں کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ طالب علم کی غلطی پر طالب علم کو نہیں استاد خود کو سزا دیتے تھے کہ میں تمہاری صحیح تربیت نہیں کرسکا، تمھاری تربیت میں یہ کمی رہ گئی ہے اور یہ میری کوتاہی ہے کہ میں تمھارے اندر ایسی اخلاقی جرأت نہ پیدا کرسکا، یہ بھی دراصل تربیت کا انداز ہوتا تھا۔ جو طلبہ مثبت افہام وتفہیم سے نہ سمجھ پائیں وہ اس ذریعہ سے بات کو گہرائی تک سمجھ جاتے اور پھر اس کو اپنے لیے حرز جان بنا لیتے۔

جامعہ تعلیم وتربیت کی تربیت گاہ بھی ہے اور تجربہ گاہ بھی۔ جامعہ کی نظر میں استاد وہ مینارۂ نور ہے جس سے جہالت کی تاریکیاں دور کی جاتی ہیں، اس لیے ارباب جامعہ نے اس بات پر خصوصی توجہ دی کہ اساتذہ کو اپنے فن کا بھی ماہر ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی ان کو پڑھانے کا فن بھی آنا

چاہیے۔اگر استاد ماہر فن ہے لیکن طلبہ کے فہم کے مطابق ترسیل نہیں کر سکتا تو وہ اچھا استاذ نہیں بن سکتا۔ اس لیے جامعہ نے اساتذہ کی تربیت کے لیے باضابطہ نظام قائم کیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی نگرانی میں ۱۹۳۸ء میں اساتذہ کی تربیت کے لیے کالج قائم کیا گیا جو مختلف ادوار سے گزر کر آج فیکلٹی آف ایجوکیشن ہے۔اس میں مختلف سطح کے اساتذہ کی تربیت کے ساتھ ساتھ تعلیم کے میدان میں تحقیقات بھی ہوتی ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خوش بختی یہ بھی رہی کہ اس کو اول دن سے بڑے نمایاں افراد کی سرپرستی حاصل رہی اور اس کو غیر معمولی صلاحیتوں کے لوگ ملے۔غیر ممالک میں جا کر اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر کے لوگ اپنی آنکھوں میں گلیمر سے بھری زندگی کے خواب سجاتے ہیں۔ایسے ہی خواب ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سید عابد حسین نے بھی سجائے ہوں گے لیکن انھوں نے جرمنی میں دوران تعلیم ہی یہ عہد کر لیا تھا کہ زندگی کا مقصد جامعہ ملیہ اسلامیہ کی آبیاری ہوگا اور انھوں نے اسے کر کے دکھایا۔یہ ایسے لوگ تھے کہ پورا ملک ان کی عظمت کا اعتراف کرتا تھا۔چنانچہ ڈاکٹر ذاکر حسین تو بعد میں صدر جمہوریہ ہند بھی مقرر ہوئے۔

جامعہ کے فارغین نے ملک وقوم کی تعمیر وترقی میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔جامعہ کا ایک اصول یہ ہے کہ صلہ کی پروا کیے بغیر خدمت کرو۔اس لیے جامعہ کے بہت سے لوگ تو ایسے ہیں جنھوں نے ملک کی خدمت میں اپنی زندگی وقف کر دی لیکن اپنی بے نفسی کی وجہ سے ہم ان سے کماحقہ واقف ہی نہیں ہیں۔مثلاً سید حسن جنھوں نے کشن گنج، بہار میں انسان اسکول کے نام سے ایک نئے انداز کے تعلیمی ادارے کا آغاز کیا اور اس ادارے نے طالب علموں میں ایک نئی روح پھونکی۔انسان اسکول کا یہ تصور جامعہ ہی کی دین ہے۔اس طرح حسنین سید ہیں، ان کی بھی سماجی خدمات قابل قدر ہیں۔علم وتحقیق کے میدان میں جامعہ کے فارغین میں پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر مظفر عالم، پروفیسر محسن عثمانی جیسے متعدد لوگ ہیں۔کھیل، صحافت، میڈیا، سیاست وغیرہ کے میدان میں جامعہ کے جن فرزندوں نے ناموری حاصل کی اس سے سبھی لوگ واقف ہیں۔کرکٹ کی تاریخ ویریندر سہواگ کے بغیر ادھوری اور ٹی وی اینکرنگ کی تاریخ برکھا دت کے بغیر نامکمل رہے گی۔فلمی دنیا کی ایک عظیم شخصیت شاہ رخ خان بھی دراصل اسی جامعہ کے پروردہ ہیں۔

جامعہ کی تاریخ اس بات کا ثبوت ہے کہ چھوٹا آغاز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ انجام بڑا نہیں ہوگا۔ جامعہ نے انتہائی کسمپرسی کے عالم میں سنگینیوں کے سائے میں اپنا تعلیمی سفر شروع کیا تھا۔ نہ منزل کا پتہ، نہ ٹھکانے کا ہوش۔ حکومت مخالف، فضا نا مساعد، نہ نصاب، نہ کتاب، نہ قلم، نہ دوات، نہ کلاس روم، نہ کتب خانہ، نہ اساتذہ، غرض حد درجہ کی بے سروسامانی میں یہ سفر شروع ہوا اور آج ایک صدی سے زیادہ کا سفر طے کر کے جامعہ نے تاریخ رقم کر دی ہے۔

جامعہ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ وقت کی رفتار کے ساتھ قدم ملا کر چلتی ہے بلکہ وقت سے آگے رہتی ہے، جب ہندوستان میں اساتذہ کی تربیت کا تصور بھی واضح نہیں تھا، اس وقت جامعہ نے اساتذہ کی تربیت کا شعبہ قائم کیا اور اس کا نام رکھا 'استادوں کا مدرسہ'۔ اسی طرح چھوٹے بچوں کا اسکول بھی جامعہ کی ایک منفرد اختراع تھی۔ اس میں اسکول سے پہلے کی بچے کی تربیت ہوتی تھی۔ آج ایسے اسکول ہر جگہ مل جاتے ہیں لیکن ایک زمانے میں شاید جامعہ ہی منفرد جگہ تھی جہاں اس کا انتظام تھا۔

جامعہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس ادارے میں نئے کورس اختیار کرنے اور تعلیم میں منفرد ڈگر پر چلنے کی خصوصی قابلیت ہے۔ اس کا ایک نمونہ تو جامعہ کا ماس کمیونی کیشن کا شعبہ ہے، یہ شعبہ بھی اس وقت قائم ہوا تھا جب شاید ملک میں اس کی سہولت یا تو بالکل نہیں تھی یا صرف معدودے چند مقامات پر ہی تھی۔ اسی طرح جامعہ میں علاقائی بنیادوں پر مطالعہ (Area Studies) کی روایت جامعہ کی اختراع تو نہیں ہے لیکن جامعہ اس میں ایک نمایاں نام ہے۔

جامعہ ایک جہد مسلسل کا نام ہے۔ یہاں سفر دینداری کا تقاضا ہے اور قیام کفر کے مترادف ہے۔ یہاں آسودگی کا مطلب امواج حوادث کے تھپیڑوں سے نبرد آزمائی کرنا ہے، کنار ساحل کے عافیت خانے میں نہیں ہے۔ اسی پیغام کے ساتھ جامعہ کا یہ سفر جاری ہے اور ان شاء اللہ العزیز جاری رہے گا۔

ڈاکٹر محمد سعید انور*

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعمیر و ترقی میں
ڈاکٹر ذاکر حسین کا کردار

ہندوستان کی تعلیمی، فکری اور تہذیبی تاریخ میں اگر کسی شخصیت نے علم و عمل، اخلاق و انسانیت اور تعلیم و سماج کے رشتے کو نئی معنویت عطا کی تو وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ذات ہے۔ وہ ایک ایسے عہد میں اُبھرے جب ملک غلامی، جہالت اور اخلاقی زوال کے اندھیروں میں گھرا ہوا تھا۔ ایسے ماحول میں انھوں نے تعلیم کو قومی بیداری اور انسانی تعمیر کا سب سے مؤثر وسیلہ قرار دیا۔ ان کا یقین تھا کہ تعلیم محض کتابی علم نہیں بلکہ زندگی کو بہتر بنانے اور انسان کو اپنی ذمہ داریوں کا شعور دینے کا عمل ہے۔ یہی فکر ان کی علمی و عملی جدوجہد کا بنیادی محرک بنی، جس کا سب سے واضح مظہر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تشکیل، تعمیر اور ارتقاء ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کا فلسفۂ تعلیم دراصل برصغیر کے اُس فکری تسلسل کا حصہ ہے جو سید احمد خاں، گاندھی جی اور اقبال جیسے مفکرین کے افکار سے ہم آہنگ نظر آتا ہے، مگر اس کی ایک نمایاں انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے تعلیم کو نہ صرف عقلی اور سائنسی بنیادوں پر استوار کیا بلکہ اس میں اخلاقی و روحانی جہت بھی شامل کی۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد ایسا انسان تیار کرنا تھا جو ذہناً بیدار، دلی طور پر مخلص اور عملی

*نائب ایڈیٹر اسلام اور عصر جدید، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ ای میل: manwar@jmi.ac.in

لحاظ سے ذمہ دار ہو۔ وہ تعلیم کو ایک مسلسل ارتقائی عمل سمجھتے تھے جو فرد کو معاشرے سے جوڑ کر قومی اتحاد، سماجی انصاف، اور انسان دوستی کی راہوں پر گامزن کرتا ہے۔[۱]

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد کے پسِ منظر میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا کردار ایک رہنما، مصلح، اور معمار کا ہے۔ انھوں نے جامعہ کو محض ایک درسگاہ نہیں بلکہ ایک اخلاقی و فکری تحریک کے طور پر دیکھا، جہاں تعلیم کے ساتھ تربیت، علم کے ساتھ عمل، اور نصاب کے ساتھ کردار سازی کو لازم قرار دیا گیا۔ ان کی نگاہ میں ایک کامیاب تعلیمی ادارہ وہ ہے جو محض سند یافتہ افراد پیدا نہ کرے بلکہ ایسے باشعور شہری تیار کرے جو علم کو انسانی فلاح کا ذریعہ بنائیں۔ آج کے عہدِ جدید میں جب تعلیم کا تصور تیزی سے مادیت اور مسابقت کی نذر ہو رہا ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین کی فکر ایک تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ہے، جو یاد دلاتی ہے کہ علم کی اصل روح اخلاق، خدمت اور انسان دوستی میں پوشیدہ ہے۔ ان کا وژن آج بھی نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے لیے ایک اخلاقی و فکری ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مضمون انھی جہتوں کے تجزیے پر مبنی ہے۔ اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی ابتدائی زندگی، ان کا فکری و تعلیمی ارتقاء، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ان کی اصلاحی و عملی کوششیں بالخصوص مالی و انتظامی بحران سے خلاصی اور ان کے فلسفۂ تعلیم کی آج کے تناظر میں معنویت کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان کے افکار کو نہ صرف تاریخی اعتبار سے سمجھا جائے بلکہ موجودہ تعلیمی نظام کے لیے رہنما اصول کے طور پر برتا جائے، تاکہ تعلیم کو محض حصولِ معاش نہیں بلکہ انسان سازی کا عمل بنایا جا سکے۔

موضوع کی اہمیت اور مقصد

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعمیر و ترقی میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا کردار محض ایک تعلیمی انتظامیہ کی سرگرمی نہیں بلکہ ایک فکری تحریک اور تہذیبی وژن کی علامت ہے۔ یہ موضوع اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے ذریعے ہم برصغیر کے اُس فکری اور عملی پس منظر کو سمجھ سکتے ہیں جس میں تعلیم کو قومی آزادی، تہذیبی خودی، اور انسان سازی کے ساتھ جوڑا گیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ کو صرف ایک تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ ایک زندہ نظریۂ تعلیم کے طور پر پیش کیا، جہاں علم محض نصابی علم نہ رہا بلکہ کردار، خدمتِ خلق، اجتماعی شعور اور قومی یکجہتی کا عملی درس بن گیا۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد ایک ایسی

انسانیت کی تشکیل تھا جو روحانی طور پر بیدار، اخلاقی طور پر مضبوط، اور سماجی طور پر حساس ہو۔ اس موضوع کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، اپنی ابتدائی جدوجہد سے لے کر جدید دور کی وسعت تک، ڈاکٹر ذاکر حسین کے نظریات اور قیادت کی مرہونِ منت رہی ہے۔ انھوں نے تعلیم کو مغربی مادیت کے مقابل ایک متوازن، باہدف اور انسان دوست متبادل کے طور پر پیش کیا۔ ان کے نزدیک جامعہ صرف تعلیمی مرکز نہیں بلکہ ایک ''تحریکی درسگاہ'' تھی جو حب الوطنی، سماجی مساوات، اور اخلاقی خودمختاری کے اصولوں پر قائم ہو۔ اس تناظر میں اس موضوع کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ کس طرح ایک فرد کی فکری بصیرت اور اخلاقی قیادت نے ایک ادارے کو نظریاتی تحریک میں بدل دیا۔ یہ مطالعہ محققین، تعلیم کے فلسفیوں، اور سماجی مفکرین کے لیے بھی نہایت اہم ہے کیونکہ اس کے ذریعے ہمیں نہ صرف ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلیمی نظریے کی عملی تعبیر ملتی ہے بلکہ یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ کسی جامع تعلیمی فلسفے کے ذریعے قوم کی فکری سمت اور تہذیبی شناخت کو کس طرح استوار کیا جاسکتا ہے۔ اس مقالے کا مقصد اسی فکری وراثت کا جائزہ لینا اور اس امر کی وضاحت کرنا ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعلیمی روایت، اس کے نظریاتی ڈھانچے، اور اس کے اخلاقی نصب العین میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی فکر آج بھی اتنی ہی معنویت رکھتی ہے جتنی اپنے قیام کے عہد میں تھی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں عمل میں آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان آزادی کی جدوجہد کے ایک نازک موڑ پر کھڑا تھا اور قومی قیادت نے محسوس کیا کہ برطانوی نظامِ تعلیم غلامانہ ذہنیت پیدا کر رہا ہے۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری جیسے اکابر نے ایک ایسے آزاد قومی ادارے کی بنیاد رکھی جو تعلیم کو قوم کی آزادی، خودی اور اخلاقی تربیت سے ہم آہنگ کرے۔ جامعہ کے قیام کا مقصد صرف علم کی فراہمی نہیں بلکہ ایک ایسے انسان کی تشکیل تھا جو علم کے ساتھ کردار کی پختگی رکھتا ہو۔ حکیم اجمل خاں نے افتتاحی موقع پر فرمایا تھا: ''جامعہ کا مقصد محض ڈگری دینا نہیں بلکہ قومی روح کو بیدار کرنا ہے۔ یہاں تعلیم غلامی سے نہیں، آزادی سے ہم آہنگ کی جائے گی۔''[۲]

اپنے قیام کے ابتدائی برسوں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کئی مشکل مراحل طے کیے۔ مالی وسائل کی کمی، سیاسی دباؤ اور تعلیمی چیلنجوں کے باوجود اس کے بانیان نے اس ادارے کو اپنے ایمان اور عزم سے قائم رکھا۔ ۱۹۲۵ء میں جامعہ کو دہلی منتقل کیا گیا، جس کے بعد اس نے ایک مستحکم تعلیمی ڈھانچہ تشکیل دینا شروع کیا۔ جامعہ نے ابتدا ہی سے خودانحصاری، اردو زبان کی ترویج، قومی تعلیم، اور کردار سازی کو اپنے بنیادی اصولوں میں شامل کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف اپنے تعلیمی دائرے کو وسعت دی بلکہ اپنے بانی کے تصورات کو نئے تناظر میں پیش کیا۔ آزادی کے بعد یہ ادارہ قومی دھارے میں شامل ہوا اور ۱۹۸۸ء میں اسے مرکزی یونیورسٹی (Central University) کا درجہ حاصل ہوا۔ تاہم اس کے بنیادی اقدار — خودمختاری، ہمہ گیر تعلیم، اور خدمتِ انسانیت — آج بھی اس کے تعلیمی وفکری ڈھانچے کی بنیاد ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے الفاظ میں: ''جامعہ محض ایک ادارہ نہیں بلکہ ایک نظریہ ہے — تعلیم کا وہ نظریہ جو انسان کو فکر، عمل اور اخلاق کی وحدت سکھاتا ہے۔''[۳]

جامعہ کا تعلیمی فلسفہ

کوئی بھی جامعہ کسی قوم کے فکری وتہذیبی شعور کی علامت ہوتی ہے۔ یہ محض تعلیم وتدریس کا مرکز نہیں بلکہ ایک ایسا فکری واخلاقی نظام ہے جو انسان کو اس کی انفرادی واجتماعی ذمہ داریوں کا شعور بخشتا ہے۔ کسی جامعہ کے قیام کے پس پشت جو فکری ونظری بنیادیں کارفرما ہوتی ہیں، وہی اس کے تعلیمی فلسفے کی تشکیل کرتی ہیں۔ اس فلسفے کے بغیر کوئی ادارہ محض عمارت اور ڈگری دینے والا مرکز بن کر رہ جاتا ہے، جبکہ حقیقی جامعہ وہ ہے جو علم کو زندگی کی تشکیلِ نو کا ذریعہ بنائے۔ تعلیم کا اصل مقصد ذہنوں کو محض معلومات سے نہیں بلکہ فکر سے منور کرنا ہے۔ جامعہ کے تعلیمی فلسفے کی تشکیل اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک یہ طے نہ کرلیا جائے کہ علم کا مقصد کیا ہے، معلم کی حیثیت کیا ہے، اور طالب علم سے کیا توقع کی جاتی ہے۔ ایک زندہ اور بیدار جامعہ وہ ہے جو اپنے نصاب، نظام اور ماحول کے ذریعے طلبہ میں فکری خود اعتمادی، اخلاقی استقامت اور تمدنی شعور پیدا کرے۔ اس کے نزدیک تعلیم محض روزگار کا وسیلہ نہیں بلکہ انسان سازی کا عمل ہے۔ جامعہ کے تعلیمی فلسفے کا ایک بنیادی تقاضا یہ ہے کہ وہ محض ماضی کی علمی روایت کی پاسبان نہ ہو بلکہ حال اور مستقبل کے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہو۔ تعلیم کی یہ دورخی — یعنی روایت

کا احترام اور اجتہاد کی جرات — کسی بھی علمی ادارے کے فکری ارتقا کی بنیاد ہے۔ جامعہ دراصل وہ مقام ہے جہاں علم محض حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ علم کی تخلیق کی جاتی ہے۔ اس کے اساتذہ اور طلبہ محقق ہونے کے ساتھ ساتھ مصلح اور خادمِ انسانیت بھی ہوتے ہیں۔ ایک ایسی جامعہ جو تحقیق اور سماجی شعور میں توازن پیدا کرے، وہی اپنے معاشرے کی فکری رہنمائی کا حق ادا کر سکتی ہے۔ جامعہ کے تعلیمی فلسفے کی تشکیل میں ایک اور اہم پہلو انسانی مرکزیت ہے۔ تعلیم کا محور انسان ہونا چاہیے — ایسا انسان جو نہ صرف اپنے وجود کی معنویت پہچانے بلکہ اپنے سماج کے لیے خیر کا سرچشمہ بنے۔ جامعہ کے تعلیمی فلسفے کی تشکیل دراصل اس کے فکری نصب العین کا تعین ہے۔ یہ فلسفہ تب ہی مؤثر ہو سکتا ہے جب وہ علم کو روحانیت، اخلاق، اور انسانیت کے ساتھ جوڑ کر دیکھے۔ ایک ایسی جامعہ جو روایت اور تجدید، عقل اور وحی، علم اور عمل، فرد اور سماج — سب کے درمیان توازن پیدا کرے، وہی اپنے زمانے میں فکری رہنمائی اور تہذیبی احیاء کا کردار ادا کر سکتی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین (1969-1897ء) برصغیر کے ممتاز ماہرِ تعلیم، فلسفی، مصلحِ قوم، اور جمہوریہ ہند کے تیسرے صدر تھے۔ وہ اُن چند شخصیات میں سے ایک ہیں جنھوں نے تعلیم کو محض ذریعۂ معاش نہیں بلکہ انسانی تہذیب و کردار کی تشکیل کا بنیادی وسیلہ قرار دیا۔ ان کی ولادت ۸/فروری ۱۸۹۷ء کو حیدرآباد (دکن) میں ایک علمی و مذہبی خانوادے میں ہوئی۔ ان کے والد فدا حسین خاں کا تعلق اٹاوہ (اتر پردیش) کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ خاندان سے تھا، جو علم، تہذیب اور اخلاقی روایات کے لیے معروف تھا، جبکہ والدہ نہایت نیک سیرت، دیندار اور تربیتِ اولاد کے معاملے میں غیر معمولی شعور رکھنے والی خاتون تھیں۔ بچپن ہی سے ان پر خاندانی ماحول کا گہرا اثر رہا۔ گھر میں دینی تعلیم، اخلاقی گفتگو اور علمی ذوق کی فضا نے ان کے ذہن کو سنجیدہ، متوازن اور جستجو پسند بنایا۔ کم عمری ہی میں والدین کے انتقال نے ان کی زندگی میں خود اعتمادی، صبر، اور استقلال کے اوصاف پیدا کیے، جب کہ بڑے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے ان کی تربیت اور تعلیم کا بیڑا اٹھایا۔ ذاکر حسین نے اپنی ازدواجی زندگی میں بھی انھی اخلاقی اقدار کو برقرار رکھا۔ ان کی اہلیہ شاہ جہاں بیگم ایک تعلیم یافتہ،

باوقار اور مخلص خاتون تھیں جنھوں نے اُن کے تعلیمی مشن میں عملی طور پر شریکِ سفر بن کر ان کے عزم کو مضبوط بنایا۔ ذاکر حسین کی شخصیت میں خاندانی تربیت، دینی اخلاقیات، علمی وراثت، اور تہذیبی شعور کے عناصر اس خوبی سے رچ بسے تھے کہ ان کی علمی وفکری زندگی ان ہی اصولوں کی عملی تفسیر بن گئی۔ وہ علم کو محض نصابی سرگرمی نہیں بلکہ انسان سازی کا ایک مسلسل عمل سمجھتے تھے۔ جیسا کہ خود انھوں نے کہا تھا کہ تعلیم کا مقصد روزگار نہیں بلکہ ایک بہتر انسان کی تشکیل ہے، اور انسان سازی صالح خاندان اور پاکیزہ معاشرت سے ہی ممکن ہے۔ یہی تصور آگے چل کر اُن کے تعلیمی فلسفے کی بنیاد بنا، جس نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے فکری واخلاقی ڈھانچے کو گہرائی عطا کی اور اُنھیں نہ صرف ایک ماہرِ تعلیم بلکہ ایک ایسی شخصیت بنا دیا جس کی نگاہ میں تعلیم، تہذیب اور خدمتِ انسانیت ایک ہی زنجیر کے تین مضبوط حلقے تھے۔

ابتدائی زندگی اور تعلیم

ڈاکٹر ذاکر حسین ۸ر فروری ۱۸۹۷ء کو حیدر آباد دکن کے ایک علمی و مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد فِدا حسین خاں ایک صاحبِ علم اور تعلیم دوست شخصیت تھے، جنھوں نے اپنے بیٹے کی فکری تربیت میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ابتدائی تعلیم حیدر آباد ہی میں حاصل کی، جہاں انھوں نے عربی، فارسی اور اسلامیات کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم بھی حاصل کی۔ بچپن ہی سے علمی رجحان اور سنجیدگی ان کی طبیعت میں رچی بسی تھی، جس کا مظہر یہ ہے کہ نوعمری ہی میں انھوں نے مطالعے اور تجزیے کی عادت کو اپنی روزمرہ زندگی کا حصہ بنالیا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے، جہاں سے انھوں نے ۱۹۱۸ء میں بی۔اے۔ (آنرز) کی ڈگری حاصل کی۔ علی گڑھ کے علمی و فکری ماحول نے ان کی سوچ کو نئی وسعت بخشی۔ اسی دوران وہ سر سید احمد خاں کے تعلیمی نظریات سے متاثر ہوئے اور تعلیم کو قوم کی اخلاقی وفکری آزادی کا ذریعہ سمجھنے لگے۔ ۱۹۲۰ء میں جب تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کے زیرِ اثر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایک بڑی تعداد میں طلبہ نے علیحدگی اختیار کی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی، تو ذاکر حسین نے بھی اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور جامعہ کے بانی اراکین میں شامل ہوئے۔[۲]

جامعہ کے قیام کے بعد وہ مزید تعلیم کے لیے جرمنی گئے، جہاں انھوں نے برلن یونیورسٹی سے معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ یہ وہ دور تھا جب ان کی فکری شخصیت کو عالمی افق پر وسعت ملی۔ مغربی تعلیم کے تجربے نے ان کے اندر مشرقی و مغربی علمی اقدار کے امتزاج کا شعور پیدا کیا، جس نے بعد میں ان کے تعلیمی فلسفے کی بنیاد رکھی۔ برلن میں قیام کے دوران انھوں نے نہ صرف یورپی تعلیمی نظام کا گہرا مطالعہ کیا بلکہ اسلامی نظریۂ تعلیم کو جدید فکری تناظر میں سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی۔[۵]

جرمنی کا قیام اور ڈاکٹریٹ

۱۹۲۳ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جرمنی روانہ ہوئے، جہاں انھوں نے برلن یونیورسٹی (University of Berlin) میں داخلہ لیا۔ اس وقت برلن علمی و فکری اعتبار سے یورپ کا اہم ترین مرکز تھا، اور فلسفہ، معاشیات، اور تعلیم کے میدانوں میں جدید مباحث اپنے عروج پر تھے۔ ذاکر حسین نے یہاں معاشیات (Economics) کے ساتھ ساتھ فلسفۂ تعلیم پر بھی گہری نظر ڈالی۔ ان کا تحقیقی موضوع اقتصادیات سے متعلق تھا، جو بعد میں ان کی فکری زندگی کا بنیادی محور بن گیا۔[۶] برلن یونیورسٹی میں قیام کے دوران انھوں نے جرمن مفکرین جیسے ایمانوئیل کانٹ، ہیگل، اور ولہلم دلتھائے کے نظریات کا مطالعہ کیا، جس نے ان کے اندر تعلیم اور اخلاقیات کے باہمی تعلق کو سمجھنے کا شعور پیدا کیا۔ وہ سمجھنے لگے کہ تعلیم محض پیشہ ورانہ تیاری نہیں بلکہ انسانی زندگی کی اخلاقی تطہیر کا ذریعہ بھی ہے۔ اس فکری تربیت کا اثر ان کے تعلیمی فلسفے میں نمایاں طور پر جھلکتا ہے، جہاں انھوں نے مشرقی روحانی روایت اور مغربی سائنسی طرزِ فکر کے درمیان ایک متوازن رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے برلن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب ان کی شخصیت ایک بین الاقوامی دانشور کے طور پر ابھری۔ ان کی تحقیقی صلاحیت اور بین الثقافتی فہم نے انھیں اس قابل بنایا کہ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تنظیم نو کے دوران ایک جدید، خودمختار، اور اخلاقی بنیادوں پر استوار تعلیمی نظام کی تشکیل کر سکیں۔ جرمنی کا یہ قیام دراصل ان کے علمی سفر کا نقطۂ عروج اور ان کے تعلیمی فلسفے کا سنگِ بنیاد ثابت ہوا۔

ہندوستان واپسی اور جامعہ سے وابستگی

۱۹۲۶ء میں برلن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین وطن واپس لوٹے تو ہندوستان اس وقت سیاسی بیداری اور تعلیمی اصلاحات کے ایک نئے دور سے گزر رہا تھا۔ انھوں نے واپسی کے فوراً بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اپنی دیرینہ وابستگی کو دوبارہ استوار کیا اور اس کے فروغ و استحکام کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ اس وقت جامعہ شدید مالی مشکلات، انتظامی کمزوریوں اور عدمِ استحکام کے دور سے گزر رہی تھی، لیکن ذاکر حسین نے اپنے عزم، تنظیمی بصیرت، اور اخلاقی قیادت سے اس ادارے کو نئی زندگی بخشی۔ ۱۹۲۷ء میں وہ جامعہ کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۹۴۸ء تک یہ فریضہ بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ ان کے دورِ قیادت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے نصب العین ''قوم کی خدمت کے لیے تعلیم'' کو عملی شکل دی۔ انھوں نے تعلیم کے ذریعے قومی تعمیر اور اخلاقی تربیت کو یکجا کیا، اور نصاب میں ایسے مضامین شامل کیے جو طلبہ کے اندر خود انحصاری، محنت، اور سادگی کے جذبات پیدا کریں۔ ذاکر حسین کے نزدیک جامعہ محض درس و تدریس کا مرکز نہیں بلکہ ایک اخلاقی و تہذیبی تجربہ گاہ تھی، جہاں تعلیم زندگی سے ہم آہنگ ہو کر طلبہ کے کردار کو سنوارتی ہے۔[۷] انھوں نے جامعہ میں اساتذہ اور طلبہ کے درمیان مساوات، تعاون اور باہمی احترام کے اصولوں کو فروغ دیا، جس کے نتیجے میں جامعہ ایک مثالی تعلیمی تحریک بن گئی۔ ان کے نزدیک علم کا مقصد سماجی خدمت اور انسان دوستی تھا، نہ کہ محض ذاتی مفاد یا مادی کامیابی۔ ان کی یہ فکر بعد میں پورے ہندوستان کے تعلیمی نظام کے لیے ایک نمونہ قرار پائی، اور ان کی قیادت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ ہندوستان کے آزاد تعلیمی تشخص کی علامت بن کر ابھری۔

جامعہ کے نصاب میں اصلاحات

ڈاکٹر ذاکر حسین کی تعلیمی فکر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ان کی نافذ کردہ نصابی اصلاحات، برصغیر کی اس مخصوص روایت کا حصہ ہیں جس میں تعلیم کو محض ذہنی ورزش یا امتحانات کے لیے تیاری کا ذریعہ نہیں سمجھا جاتا تھا، بلکہ اسے انسان سازی، کردار سازی اور سماج سازی کی ایک ہمہ جہت کوشش

قرار دیا جاتا تھا۔ان کی نظر میں تعلیم کا مقصد وہی تھا جسے وہ بارہا اپنی تقاریر اور تحریروں میں دہراتے رہے کہ علم اگر انسان کے دل ودماغ دونوں کو نہ بدلے، اگر وہ ہاتھوں کو ہنر نہ دے اور ذہن کو بصیرت نہ بخشے، اگر وہ زندگی کے عملی میدانوں سے رشتہ نہ جوڑے اور محض کتابی صفحات تک محدود رہ جائے، تو ایسی تعلیم معاشرے میں کوئی حقیقی تبدیلی پیدا نہیں کرسکتی۔ جامعہ میں ان کے دور کی اصلاحات اسی وسیع تر تصور کی عملی شکل تھیں۔انھوں نے نصاب کو محض مضامین کے مجموعے کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ اسے ایک مسلسل تربیتی عمل سمجھا جس میں طلبہ کو نہ صرف نصابی دروس ملتے ہیں بلکہ وہ تربیت بھی پاتے ہیں، وہ چیزیں سیکھتے بھی ہیں اور ان سیکھے ہوئے امور کو اپنے ہاتھوں، اپنے عمل اور اپنی سماجی ذمہ داریوں میں ڈھالنے کا تجربہ بھی کرتے ہیں۔ان کے مطابق تعلیم کا پہلا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے وجود کو بہتر سمجھے، اپنے ماحول کے ساتھ مثبت رشتہ قائم کرے اور اپنی صلاحیتوں کو قوم وملت کی بھلائی کے لیے استعمال کرنے کے قابل بنے۔ اسی سوچ کے تحت انھوں نے جامعہ کے نصاب میں عملی سرگرمیوں کو مرکزی حیثیت دی۔ ان کے نزدیک ہاتھ کے کام اور ذہنی مشق کے درمیان جو فاصلہ روایتی تعلیمی اداروں میں دکھائی دیتا ہے، وہ فاصلہ نہ صرف تعلیم کو نیم جان بنا دیتا ہے بلکہ انسانی شخصیت کو بھی یک رخی کر دیتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے دستکاری، زرعی تجربات، صنعت وحرفت، صحت وصفائی، ماحول کے احترام، اور سماجی خدمت جیسے عملی شعبوں کو نصاب کا لازمی حصہ بنایا۔ان سب کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم یافتہ فرد صرف ڈگری یافتہ نہ ہو بلکہ معاشرتی طور پر بیدار، اخلاقی طور پر مضبوط، اور عملی زندگی کے تقاضوں سے آشنا ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ، انھوں نے اخلاقی تربیت کو نصابی اصلاحات کا بنیادی ستون قرار دیا، کیوں کہ ان کے نزدیک اخلاقیات وہ بنیاد ہیں جن کے بغیر تمام علم بے سمت ہوجاتا ہے۔ وہ طلبہ میں دیانت، محنت، سچائی، ضبطِ نفس، ایثار اور خدمتِ خلق کے جذبات کو پروان چڑھانا چاہتے تھے، اس لیے نصاب میں ایسے مضامین، گفتگوئیں، سرگرمیاں اور عملی مواقع فراہم کیے گئے جن سے طلبہ کا مزاج، رویہ اور کردار مثبت اخلاقی اقدار سے آراستہ ہو سکے۔ یہ اصلاحات محض نظری نہیں تھیں، بلکہ جامعہ کی روزمرہ زندگی میں محسوس کی جاسکتی تھیں؛ صبح کی دعا سے لے کر ورکشاپ کے عملی ماحول تک، جماعتی صلاحیت سے لے کر سماجی شعور تک، ہر سطح پر تعلیم کو اخلاقی روح فراہم کی گئی تھی۔ مزید یہ کہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے

زبان کی اہمیت پر بھی زور دیا۔ ان کا ماننا تھا کہ علم اس وقت تک عام فہم اور زندہ نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنی زبان میں نہ ہو— وہ زبان جس میں انسان سوچتا ہے، جذبات پاتا ہے، مفاہیم کو واضح کرتا ہے اور سماجی رشتوں سے جڑا رہتا ہے۔ یہ وجہ تھی کہ انھوں نے جامعہ میں اردو اور ہندی دونوں کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر مضبوط کیا تاکہ تعلیمی عمل نہ صرف طلبہ کی ذہنی رسائی کے اندر رہے بلکہ معاشرے میں علم کی ترسیل بھی آسان ہو۔ وہ زبان کو صرف رابطے کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے شخصیت کے ارتقا، تہذیبی وحدت، اور فکری پختگی کی بنیاد سمجھتے تھے۔

جہاں تک ان کی اصلاحات کے فلسفیانہ پس منظر کا تعلق ہے، انھیں سمجھنے کے لیے صرف ان کی تقریروں اور عملی اقدامات کو دیکھنا کافی نہیں، بلکہ ان کی شخصی تربیت، فکری جھکاؤ، اور عالمی و مقامی تعلیمی مباحث سے ان کی واقفیت کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ان کی شخصیت میں گاندھیائی تعلیم کی بازگشت بھی ملتی ہے، مغربی فلاسفۂ تعلیم کی بصیرت بھی، اور مشرقی تہذیبی اقدار کا وقار بھی۔ یہی جامعیت انھیں ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ ان اصلاحات کا مقصد نہ صرف تعلیمی معیار کو بہتر بنانا تھا بلکہ تعلیم کو ایک سماجی مشن میں تبدیل کرنا بھی تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے نزدیک جامعہ کا ہر طالب علم نہ صرف ایک فرد تھا بلکہ مستقبل کی قوم کا معمار بھی تھا، اس لیے نصاب میں شامل ہر تبدیلی کو اس زاویے سے دیکھا جاتا تھا کہ وہ فرد کی شخصیت کو کس سطح پر بہتر بنائے گی اور معاشرے کو کس حد تک فائدہ پہنچائے گی۔ ان کی شخصیت، فکر اور نصابی اصلاحات کی تفصیل کے لیے، آن لائن دستیاب مستند ماخذ Dr. Zakir Husain: A Biography (M. Mujeeb) اہم ترین حوالے کے طور پر سامنے آتی ہے۔

مالی وانتظامی بحران اور ان کا حل

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ابتدائی تاریخ کا سب سے نازک اور فیصلہ کن موڑ وہ بحران تھا جو ۱۹۲۲–۱۹۲۵ء کے دوران اچانک اور شدت کے ساتھ سامنے آیا جب ڈاکٹر ذاکر حسین جرمنی میں تعلیم کے لیے گئے، تو واپس آنے پر جامعہ کا منظر نامہ یکسر بدل چکا تھا۔ خلافت کمیٹی کی مالی معاونت محض ایک سال تک محدود تھی، اور اس کے بعد ادارے کی بقا سوال بن گئی تھی۔ لیکن مالی بدحالی سے زیادہ پریشان کن

بات یہ تھی کہ جامعہ کے قیام کے ابتدائی جوش وخروش کی حرارت سرد پڑ چکی تھی اور قوم کی مختلف برادریوں نے اس کی طرف سے منہ موڑ لیا تھا۔ ایک عینی شاہد کے مطابق جامعہ ایسی حالت میں تھی کہ نہ سرمایہ تھا، نہ قوم کی پشت پناہی، اور نہ مستقبل کی کوئی واضح امید۔ مزید برآں، خود بانیانِ جامعہ کے ایک حصے کے ذہن میں بھی اس کے مستقبل کے بارے میں تضادات پائے جاتے تھے جس کا اظہار اس وقت ہوا جب مولانا محمد علی نے ۱۹۲۳ء میں جامعہ کے طلبہ کے ایک استقبالیہ میں یہ کہہ دیا کہ انھوں نے جامعہ کے بڑھنے یا مستقل رہنے کا تصور کبھی نہیں کیا تھا۔

اسی دوران جامعہ کے بعض کارکنوں اور طلبہ نے جرمنی میں موجود ذاکر حسین کو تار بھیجا کہ ادارے کے خاتمے کی باتیں کی جارہی ہیں، اور ان سے رائے طلب کی۔ جواب فوری اور فیصلہ کن تھا: ''میں اور میرے ساتھی اپنی زندگی جامعہ پر نثار کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بس اسے ہماری واپسی تک زندہ رکھیے گا۔'' یہ جواب جامعہ کی تاریخ کا ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوا، جس نے ادارے کے وجود میں نئی روح پھونک دی۔ حکیم اجمل خان وہ شخصیت تھے جنھوں نے مشکل ترین حالات میں بھی جامعہ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جب جامعہ کو دہلی منتقل کرنے کے فیصلے پر اختلافات بڑھے تو حکیم صاحب نے اپنی ثابت قدمی سے یہ فیصلہ منظور کرایا۔ انھوں نے نہ صرف ذاتی جائیداد تک بیچ کر جامعہ کو سہارا دیا بلکہ اپنی شخصیت، تدبر اور وقار کے ذریعے متعدد سیاسی اور سماجی رہنماؤں کی حمایت بھی حاصل کی۔ ادھر مہاتما گاندھی بھی جامعہ کے سب سے بڑے پشت پناہ کے طور پر سامنے آئے۔ انھوں نے صاف کہا کہ اگر مسئلہ محض پیسے کا ہے تو وہ خود بھیک مانگنے کو تیار ہیں۔ گاندھی جی کے اس اعلان نے جامعہ کی قیادت کا حوصلہ بلند کر دیا۔ جامعہ کی دہلی منتقلی کے بعد نئے مسائل نے جنم لیا — دور دراز سے آنے والے طلبہ کا قیام، اساتذہ کی کمی، عمارت کی عدم دستیابی، اور سب سے بڑھ کر مالی وسائل کی شدید قلت۔ اس کے باوجود جامعہ کا تعلیمی وفکری معیار بلند رکھنے کی کوششیں جاری رہیں۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور دیگر رہنماؤں کی سرپرستی کے باوجود مالی بحران مستقل بنا ہوا تھا۔ نظامِ حیدرآباد کی ماہانہ امداد اس وجہ سے منقطع ہوگئی کہ جامعہ کے چند کارکن سیاسی تحریکوں میں شامل ہوئے تھے، حالانکہ انھوں نے اس سے پہلے استعفیٰ دے دیا تھا۔ نوابِ بھوپال نے امداد کی مشروط پیشکش کی کہ جامعہ سیاست سے مکمل لاتعلقی کا اعلان کرے، لیکن ذاکر حسین نے اصولی طور پر اس شرط کو مسترد کر دیا۔

۲۷-۱۹۲۶ء میں جامعہ کو مضبوط ادارہ جاتی ڈھانچہ دینے کے لیے نئی مینجنگ کمیٹی تشکیل دی گئی، جس میں جواہر لال نہرو، علی برادران، مولانا آزاد، عبدالماجد خواجہ، جمنالال بجاج، اور دیگر ممتاز شخصیات شامل تھیں، مگر ذاکر حسین کو بخوبی اندازہ تھا کہ صرف کمیٹیاں مسئلہ حل نہیں کر سکتیں۔ اس وقت انھوں نے ایک جرات مندانہ تجویز پیش کی — جامعہ کو اس کے اساتذہ سنبھالیں، اپنی زندگیاں اس کے لیے وقف کریں، اور ادارے کو اپنی محنت سے چلائیں۔ یہ تجویز بعد میں ''انجمنِ تعلیم ملی'' کے قیام کی بنیاد بنی۔ گاندھی جی نے بھی اس تجویز کو سراہا اور جامعہ کی خودمختار تعلیمی تحریک کے حقیقی امکانات دیکھے۔ اسی دوران جامعہ کی داخلی فضا میں بھی اہم تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ ذاکر حسین کی واپسی، رشید احمد، محمد مجیب اور سید عابد جیسے ہم خیال نوجوانوں کی شمولیت نے ادارے میں نئی توانائی پیدا کی۔ ذاکر حسین نے سخت محنت، نظم و ضبط، اور عملی قیادت کے ذریعے ادارے کی تعلیمی سمت متعین کی۔ ان کی شخصیت طلبہ، اساتذہ اور رہنماؤں کے لیے یکساں طور پر اعتماد کا محور بن گئی۔ جامعہ کی تاریخ کا یہ پورا دور اس حقیقت کا مظہر ہے کہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان قیادت، نظریاتی خلوص، اعلیٰ اصول، بےلوث خدمت، اور واضح مقصدیت ایک ایسے ادارے کو بھی سنبھال سکتے ہیں جو زوال کے دہانے پر ہو۔ جامعہ بحران سے نکل کر نہ صرف زندہ رہی بلکہ آگے چل کر ایک عظیم قومی یونیورسٹی بن گئی — اور اس احیا کے مرکز میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمات تاریخ ساز حیثیت رکھتی ہیں۔[۸]

ڈاکٹر ذاکر حسین اور قومی تعلیم

ڈاکٹر ذاکر حسین اپنی کتاب **قومی تعلیم** میں تعلیم کو ایک ایسی ہمہ جہتی اور ہمہ گیر قوت قرار دیتے ہیں جو صرف فرد کی علمی بالیدگی تک محدود نہیں رہتی بلکہ پوری قوم کی فکری، اخلاقی اور سماجی زندگی کی تشکیلِ نو میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ ان کے نزدیک یہ تصورِ تعلیم محض نصابی معلومات، کتابی ذخیرے یا پیشہ ورانہ مہارتوں کے مجموعے پر قائم نہیں، بلکہ اس کا سب سے اہم پہلو وہ اخلاقی و انسانی تشکیل ہے جو ایک فرد کو نفع بخش شہری میں تبدیل کر دیتی ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تعلیم کا اصل جوہر اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب وہ فرد کو سوچنے، سمجھنے، جانچنے اور معاشرے کے بڑے مقاصد میں اپنا فعال کردار ادا کرنے کے قابل بنائے۔ ڈاکٹر حسین اس بات سے متفق نہیں کہ تعلیم کا مقصد صرف

ذہنی تربیت یا پیشہ ورانہ تیاری ہونا چاہیے؛ بلکہ ان کے نزدیک اس کا بنیادی ہدف ایک ''زندہ، باشعور اور خدمت گزار شہری'' کی تشکیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تعلیم کو قوم کی اخلاقی توانائی، فکری وسعت اور سماجی رفاہ کے لیے ناگزیر سرمایہ سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین استاد کے کردار پر بھی گہری گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک استاد محض معلومات کا منتقل کرنے والا نہیں بلکہ ایک فکری رہنما، ایک اخلاقی مربی اور ایک ایسا شخصیت ساز ہے جو نوجوان ذہنوں کو فہم وبصیرت سے آشنا کرتا ہے۔ وہ استاد کی اس ذمہ داری پر زور دیتے ہیں کہ وہ طلبا کے ذہنوں میں سوال کرنے، سیکھنے، تفتیش کرنے اور تنقیدی نظر پیدا کرنے کی صلاحیت بیدار کرے۔ تعلیم کی افادیت اسی وقت ممکن ہے جب استاد خود علمی پختگی، اخلاقی دیانت اور سماجی فہم کا اعلیٰ نمونہ ہو۔ چنانچہ وہ استاد کو تعلیم کے پورے نظام کا محور قرار دیتے ہیں اور اس کی تربیت، اخلاقی ذمہ داری اور فکری معیار کو قومی تعلیمی ڈھانچے کا بنیادی جز سمجھتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر حسین نصاب اور تدریسی طریقوں پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں نصاب ایسا ہونا چاہیے جو زندگی کے حقیقت پسندانہ تقاضوں سے مطابقت رکھتا ہو اور جس میں عملی ہنر، نتیجہ خیز سرگرمی اور تجربات سیکھنے کے مواقع شامل ہوں۔ وہ اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ تعلیم محض کتابی معلومات تک محدود رہے اور عملی زندگی سے اس کا رشتہ کمزور ہو جائے۔ ان کا تصورِ نصاب ''نظریہ وعمل'' کی ہم آہنگی پر قائم ہے، جس کے نتیجے میں طلبا نہ صرف علمی اعتبار سے مضبوط ہوتے ہیں بلکہ معاشرتی کردار اور عملی ذمہ داریوں کے لیے بھی تیار ہوتے ہیں۔

قومی شعور کی تربیت ڈاکٹر ذاکر حسین کے نظریۂ تعلیم کی بنیادی روح ہے۔ ان کے نزدیک قومی تعلیم وہ ہے جو نوجوانوں کو اپنی تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی شناخت کا شعور عطا کرے، انھیں اپنے ماضی کی میراث سے جوڑے، اور انھیں اپنے حال اور مستقبل کی ذمہ داریوں کا احساس دلائے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ایک قوم اس وقت تک مضبوط، متحد اور فعال نہیں ہوسکتی جب تک اس کے نوجوان اپنی شناخت، اپنی اقدار اور اپنے مشترکہ مقاصد کے ساتھ وابستگی محسوس نہ کریں۔ اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ نصاب ایک ایسی فکری فضا پیدا کرے جس میں طلبا اپنی تہذیبی جڑوں سے بھی آگاہ ہوں اور جدید عالمی تقاضوں سے بھی ہم آہنگ رہیں۔ اس شعور کے بغیر فرد صرف اپنی ذاتی ترقی تک محدود رہتا ہے، جبکہ ڈاکٹر حسین تعلیم کو اجتماعی بھلائی، قومی وحدت اور سماجی خدمت کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر

حسین کے نظریۂ تعلیم پر گاندھی کے ''نئی تعلیم'' کے اثرات بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ تعلیم میں کام، ہنر اور پیداواریت کو مرکزی مقام دینے کے قائل ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں عملی ہنر نہ صرف طلبا کی خود اعتمادی بڑھاتا ہے بلکہ انھیں خود انحصاری اور سماجی خدمت کے فلسفے سے بھی قریب کرتا ہے۔ گاندھی کے نظریے کی طرح ڈاکٹر حسین بھی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تعلیم محنت، خدمت اور سادگی کے اصولوں پر مبنی ہونی چاہیے، اور اس کا مقصد ایک ایسے شہری کی تشکیل ہونا چاہیے جو اخلاقی طور پر مضبوط، ذہنی طور پر روشن اور عملی طور پر کارآمد ہو۔ نئی تعلیم کے اس پہلو نے ان کے پورے نظریۂ تعلیم کو زیادہ عملی، انسانی اور ہمہ جہتی بنادیا۔

تعلیم کے بارے میں ان کا ایک نہایت اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ تعلیم قوم کی ''اجتماعی یادداشت'' کو زندہ رکھتی ہے۔ نصاب کے ذریعے قوم اپنی تہذیبی روایات، علمی ورثے اور فکری تجربات کو نئی نسل تک منتقل کرتی ہے۔ ان کے نزدیک ایک قوم اپنی تہذیب سے اس وقت ٹوٹ جاتی ہے جب اس کا تعلیمی نظام اپنی ہی تاریخ وفرہنگ سے منقطع ہو جائے۔ اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ نصاب قوم کی علمی میراث کو محفوظ رکھتے ہوئے نوجوانوں کو مستقبل کے چیلنجوں کے لیے بھی تیار کرے۔ یہی دوہری ذمہ داری—ماضی کی حفاظت اور مستقبل کی تعمیر— قومی تعلیم کی روح ہے۔ آخر میں ڈاکٹر ذاکر حسین تعلیم کو فرد اور قوم دونوں کی ہمہ گیر ترقی کا لازمی ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قومی ترقی صرف معاشی اور تکنیکی ترقی تک محدود نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے لیے اخلاقی طاقت، باہمی اعتماد، تعاون کا جذبہ اور خدمتِ خلق کی روح ضروری ہے۔ تعلیم جب اس اخلاقی اور سماجی مقصد کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو پوری قوم ترقی، اتحاد اور استحکام کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اساتذہ کی تربیت، نصاب کی متوازن تشکیل اور عملی ہنر کو تعلیمی ڈھانچے میں لازمی حیثیت دینے کی سفارش کرتے ہیں۔ ان کی کتاب قومی تعلیم نہ صرف ایک فکری رہنمائی فراہم کرتی ہے بلکہ آج کے دور کی تعلیمی پالیسیوں کے لیے بھی ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے۔[9]

ڈاکٹر ذاکر حسین کی ہمہ جہت شخصیت

ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت اپنے اندر ایسی ہمہ جہتی رکھتی ہے جس نے نہ صرف ہندوستانی

تعلیمی روایت کو نئے اصول و معانی عطا کیے بلکہ اخلاق، خدمت، اخلاقی تربیت اور قوم سازی کے ایسے تصورات بھی پیش کیے جنھوں نے عصری تعلیم کے فکری تناظر کو نئی زندگی بخشی۔ ان کے کردار کی سب سے نمایاں جہت ان کا وہ اخلاقی وقار تھا جو ان کی گفتگو، تحریر اور عملی زندگی میں واضح طور پر جھلکتا ہے۔ وہ تعلیم کو محض ذہنی مشق یا روزگار کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے تہذیبی تربیت، انسانی حساسیت، سماجی ذمہ داری اور قوم کی روحانی و اخلاقی تشکیل کا بنیادی وسیلہ قرار دیتے تھے۔ ان کی شخصیت کے اندر ایک ساتھ فکر کی گہرائی، اظہار کی لطافت، فیصلہ سازی میں سنجیدگی، مزاج کی سادگی، طبیعت کی انکساری اور عمل میں استقامت موجود تھی۔ یہی اوصاف وہ جمالیاتی خوبی پیدا کرتے تھے جو انھیں عام تعلیمی رہنماؤں سے بالکل ممتاز کر دیتی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی کردار سازی کا بنیادی سرچشمہ دو عناصر تھے: ایک طرف اسلامی تہذیب کی گہری روح جس میں خدمت، ایثار اور سچائی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، اور دوسری طرف عصری انسانی فکر جس میں مکالمہ، رواداری، سوشل جسٹس اور انسانی وقار کی اقدار شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت نے مشرق و مغرب، روایت و جدیدیت اور فکر و عمل کے درمیان ایک حسین امتزاج پیدا کیا۔ وہ نہ تو مغرب دشمن تھے اور نہ اندھی تقلید کے قائل؛ نہ وہ روایت کو جامد سمجھتے تھے اور نہ جدیدیت کو بے سمت۔ ان کے نزدیک اصل قدر یہ تھی کہ تعلیم انسان کو ایسا باشعور فرد بنائے جو اپنی قوم کے لیے چشمِ بصیرت، اخلاقی رہنمائی اور مثبت عمل کا ذریعہ ثابت ہو۔ یہی ہمہ جہتی انھیں ایک منفرد مفکر، ایک کامیاب منتظم، اور ایک سچے انسان دوست رہنما کی حیثیت عطا کرتی ہے۔[۱۰]

اگر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کی ہمہ جہتی پوری شان کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ وہ محض ایک سربراہِ ادارہ نہ تھے بلکہ بیک وقت معلم، محقق، مفکر، منتظم، تربیت کار، اصلاح کار اور ایک سچے قوم دوست انسان تھے۔ جامعہ کو ابتدائی شدید مالی بحران، داخلی اختلافات، بیرونی بے اعتنائی اور سیاسی تحریکوں کے طوفان کے دوران جس استقامت، دور بینی اور ایثار کے ساتھ انھوں نے سہارا دیا، وہ اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ وہ ایک غیر معمولی قوتِ ارادی رکھتے تھے اور ادارہ سازی کی اصل روح کو سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک تعلیمی ادارہ صرف عمارتوں، دفاتر اور امتحانات کا نام نہیں، بلکہ ایک زندہ اخلاقی و تہذیبی کمیونٹی ہوتا ہے۔ وہ اس کمیونٹی کے ہر فرد کو

اس کی ذمہ داری، کردار، کردار سازی اور قومی شعور سے جوڑنا چاہتے تھے۔ جب وہ جرمنی سے واپس آئے تو جامعہ کی عمارت قرول باغ کے ایک کرائے کے مکان میں تھی، مالی مشکلات حد سے زیادہ تھیں، اور اس کے مستقبل کے متعلق بدگمانی عام تھی۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین نے ان تمام مشکلات کو اپنی منزل کا حصہ سمجھا اور جامعہ کے ہر طبقے، اساتذہ، طلبہ، کارکنان اور معاونین میں ایسی روح دوڑادی جس نے جامعہ کو محض زندہ نہیں رکھا بلکہ اس کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ ان کی عملی قیادت نے یہ ثابت کیا کہ ایک بااخلاق، دوراندیش اور منظم رہنما اپنی شخصیت کی قوت سے اداروں کو نہ صرف بچا سکتا ہے بلکہ انھیں نئی راہیں بھی دکھا سکتا ہے۔ ان کی ٹیم ورک، تربیتی حکمتِ عملی، اور عملی مثالوں نے جامعہ میں ایسی تعلیم کو فروغ دیا جس کے مرکز میں انسان، اس کا کردار، اس کی معاشرتی ذمہ داری اور اس کی اخلاقی نکھار تھا۔[۱۱]

ڈاکٹر ذاکر حسین کی ہمہ جہتی بطور صدرِ جمہوریہ بھی پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔ ان کے اندر وہ گہرائی، سنجیدگی اور متانت موجود تھی جو کسی بھی ریاستی سربراہ کے لیے بنیادی شرائط ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں ایک ایسا انسانی لمس، تہذیبی وقار اور فکری حساسیت بھی تھی جس نے ان کی صدارت کو محض آئینی ذمہ داری نہیں رہنے دیا بلکہ ایک اخلاقی مثال بنا دیا۔ وہ نہ صرف ہندوستان کے صدر تھے بلکہ ایک استاد کی حیثیت سے پوری قوم کو تعلیم، خدمت، دیانت اور انسان دوستی کا درس دے رہے تھے۔ ان کے خطابات میں تہذیب کی مہک، زبان کی لطافت، فکر کی گہرائی اور انسان دوستی کی اپیل نمایاں نظر آتی ہے۔ انھوں نے تعلیم کو قومی ترقی کا بنیادی ستون قرار دیا اور کہا کہ ایک قوم اس وقت تک مضبوط نہیں ہوسکتی جب تک اس کے تعلیمی ادارے کردار سازی، تحقیق، تخلیق، تہذیب اور سچائی کے مراکز نہ بن جائیں۔ وہ صدرِ جمہوریہ ہوتے ہوئے بھی انسانیت، تہذیب اور اخلاق کو اپنی تمام ذمہ داریوں کا محور بنائے رکھتے تھے۔ ان کی سادگی، اصول پسندی، شفافیت، بے لوث حب الوطنی اور انسان دوستی نے انھیں ان رہنماؤں کی صف میں لا کھڑا کیا جن کی قیادت مدتوں یاد رکھی جاتی ہے۔ ان کی ذاتی زندگی میں ریاکاری، دکھاوا، یا اقتدار پسندی کا کوئی شائبہ بھی نہ تھا۔ ان کی شخصیت کا یہی توازن — فکری وسعت، عملی استقامت، اخلاقی پختگی اور انسانی حساسیت — انھیں ایک ''عظیم ہندوستانی'' اور ''عالمی انسان'' کی حیثیت عطا کرتا ہے۔

حرفِ آخر

ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں—ان کی تعلیمی بصیرت، قومی خدمات، اخلاقی قیادت، اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستگی— کا مجموعی مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ محض ایک فرد نہیں بلکہ ایک علمی وتہذیبی روایت کے حقیقی نمائندہ تھے۔ تعلیم کو انھوں نے قوموں کی اخلاقی اور سماجی تشکیل کا بنیادی وسیلہ قرار دیا، اور اپنی پوری علمی وانتظامی زندگی اسی اصول کے فروغ میں صرف کی۔ جامعہ میں ان کا کردار صرف ایک وائس چانسلر یا منتظم کا نہ تھا، بلکہ ایک فکری معمار کا تھا جس نے بحرانوں میں بھی ادارے کو اصول، شفافیت اور مکالمے کے ساتھ آگے بڑھایا۔ بطور صدرِ جمہوریہ بھی ان کی سوچ کا مرکز انسان، تعلیم اور اخلاق رہا۔ ان کے خطبات اور تحریریں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ وہ قوم کو صرف مادی ترقی تک محدود نہیں دیکھنا چاہتے تھے بلکہ ایک ایسے سماج کا خواب دیکھتے تھے جو تہذیب، برداشت، انصاف اور اجتماعی شعور پر قائم ہو۔ ان کے نزدیک ایک مضبوط قوم وہی ہے جو اپنے تاریخی ورثے سے جڑی ہو، اپنی اخلاقی قدروں کی حفاظت کرے، اور اپنے شہریوں کو معاشرتی ذمہ داری کا احساس دلائے۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت— معلم، مصلح، مصنف، منتظم اور سربراہِ مملکت—اس امر کی شاہد ہے کہ ان کی قیادت علم، کردار اور خدمت کے امتزاج سے تشکیل پاتی ہے۔ آخر میں، ذاکر حسین ہمیں یہ پیغام دیتے ہیں کہ قوموں کا مستقبل علم کی روشنی، کردار کی مضبوطی اور اجتماعی ذمہ داری کے احساس ہی سے روشن ہوتا ہے، اور یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا درس ہے۔

حواشی وماخذ

۱۔ ذاکر حسین، خطباتِ تعلیم، دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۰ء، ص: ۳۲

۲۔ حکیم اجمل خاں، خطبہ صدارت بہ موقع جلسہ تقسیم اسناد منعقدہ ۱۹۲۱ء

۳۔ ذاکر حسین، خطباتِ جامعہ، مطبع جامعہ، دہلی، ۱۹۶۱ء

۴۔ ذاکر حسین، خطباتِ جامعہ، دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ پبلیکیشنز، ۱۹۴۸ء، ص: ۱۱

۵۔ ایم۔ مجیب Education and Traditional Values، نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۷۲ء

۶۔ ایم۔ مجیب، Education and Traditional Values، نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۷۲ء، ص: ۴۴

۷۔ ذاکر حسین، خطباتِ جامعہ، دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ پبلیکیشنز، ۱۹۴۸ء، ص: ۳۹

۸۔ President Dr Zakir Husain: A Quest for Excellence A G. Noprani, Bombay Popular Parkashan

۹۔ ذاکر حسین، قومی تعلیم، ص: ۲۴-۱ دفتر حلقہ ہمدردان جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۱۰۔ Mohammad Mujeeb, Dr. Zakir Husain: A Biography, National Book Trust, India, 1972

۱۱۔ Abdul Gafoor Abdul Majeed Noorani, President Zakir Husain: A Quest for Excellence, Popular Prakashan

ڈاکٹر محمد عمر فاروق *

جامعہ ملیہ اسلامیہ
تعمیر وترقی کے مراحل اور جمنالال بجاج

جامعہ ملیہ اسلامیہ، برصغیر ہند کی بیسویں صدی عیسوی کی ایک اہم قومی تعلیمی تحریک شمار کی جاتی ہے، جس نے اپنی عملی کاوشوں کے ذریعہ فروغ تعلیم کے حوالے سے نمایاں خدمات انجام دی ہے۔اس تحریک کی تاسیس اور اس کے ارتقائی سفر میں بہت سے مسلم وغیر مسلم دانش وروں اور قومی وملی رہنماؤں نے اہم کردار ادا کیا۔انہی میں ایک نمایاں نام جمنالال بجاج کا ہے، جو نہ صرف ہندوستان کی تحریک آزادی میں گاندھی جی کے قریبی رفیق رہے بلکہ بیسویں صدی عیسوی کی اہم قومی تعلیمی تحریک جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مالی، اخلاقی اور فکری سطح پر مضبوط کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔اس مقالے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام، تاریخی پس منظر اور اس کے مالی وادارہ جاتی بحرانوں کا جائزہ لیتے ہوئے، یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جمنالال بجاج نے کن حالات اور کس ماحول میں جامعہ کی سرپرستی قبول کی؟ انھوں نے اپنے کن عملی اقدامات کے ذریعے جامعہ کو سہارا دیا؟ اوران کے افکار ونظریات نے جامعہ تحریک کی فکر اور اس کے منہج کو کس طرح متاثر کیا؟ مقالہ میں بنیادی وثانوی مآخذ سے استفادہ کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک کے لیے جمنالال بجاج کے کردار کا تنقیدی و

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-۲۵ ای میل: mfarooque@jmi.ac.in

تجزیاتی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے، تاکہ قارئین بیسویں صدی عیسوی کی اس اہم قومی تعلیمی تحریک میں انسانی معاشرے کے مختلف گروہوں کی فکری وعملی کاوشوں سے روشناس ہوسکیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ، تحریک ترک موالات، جسے عدم تعاون تحریک کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، کے پس منظر میں وجود میں آئی، جس کا بنیادی مقصد حکومتی اثرات سے مبرّ املکی عوام کو ان کی اپنی زبان میں تعلیم دینا تھا۔ اسی لیے اس قومی تعلیمی تحریک نے اپنے قیام کے آغاز سے ہی قومیت، یکجہتی، تعلیم اور ہندوستانی تہذیب وثقافت کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ادارے کے مقاصد کی تکمیل اور اس کے فروغ میں بانیانِ جامعہ، جن میں مسلم اور غیر مسلم دونوں طبقے کے قومی رہنما شامل تھے، کی روشن خیالی نے بڑا ہی مثبت اور اساسی کردار ادا کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ جامعہ تحریک غیر ملکی حکومت سے عدم تعاون کے نتیجے میں وجود میں آئی، تاہم اس کی بقا اور استحکام مختصر عرصے میں ہی شدید مالی بحرانوں کا شکار ہوگیا۔ ایسے وقت میں جب جامعہ کا مستقبل خطرے میں تھا، ملک کے جن چند غیر مسلم رہنماؤں نے آگے بڑھ کر نہ صرف اس کی سرپرستی کی بلکہ اپنے ذاتی سرمایے اور اثر ورسوخ کو بروئے کار لاتے ہوئے اسے قائم رکھا اور ترقی کی نئی شاہراہوں کی طرف گامزن کیا، ان میں ایک اہم نام جمنالال بجاج کا ہے۔ یہ مقالہ اسی تاریخی حقیقت کا احاطہ کرتا ہے کہ کس طرح ایک غیر مسلم قومی رہنما نے ایک ایسے تعلیمی ادارے کی سرپرستی کو اپنا قومی واخلاقی فریضہ سمجھتے ہوئے اس کے مستقبل کو محفوظ بنایا، جس کا قیام بنیادی طور پر مسلم معاشرے اور قائدین کے ذریعہ عمل میں آیا تھا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ: پس منظر اور قیام

برطانوی ہندوستان میں مسلمانان ہند کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی زبوں حالی نے ایک ایسے ادارے کی ضرورت کو جنم دیا، جو مسلم قوم کے اندر خوداعتمادی، آزادی اور قومی شعور بیدار کر سکے۔ علی گڑھ تحریک نے اگرچہ جدید تعلیم کے دروازے کھولے، لیکن اوائل بیسویں صدی عیسوی کی سیاسی فضا میں ترک موالات تحریک کے زیر اثر مسلمانوں میں ایک خودمختار، حکومتی اثر سے آزاد قومی تعلیمی تحریک وادارے کے قیام کا جذبہ پیدا ہوا۔ اسی جذبے کے تحت ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ

اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بانیوں میں مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، عبدالمجید خواجہ اور دیگر قومی وملی رہنما شامل تھے۔ ابتدائی ایام میں جامعہ کا سب سے بڑا بحران مالی وسائل کی فراہمی کا تھا۔ اس کے پاس مستقل ذریعہ آمدنی، مختلف قسم کے وسائل اور کیمپس کی کمی تھی۔ اس کمی نے بارہا اس ادارے کو بند ہونے کے دہانے تک پہنچا دیا۔ سیاسی حالات، معاشی ضرورتوں اور مستقل کیمپس کے حصول کی خاطر جامعہ کو دہلی منتقل کیا گیا۔ اس طرح پہلے کچھ سالوں تک قرول باغ پھر اوکھلا میں جامعہ کا مستقل کیمپس قائم ہوا اور آج یہی ادارہ ملک کی اہم مرکزی یونی ورسٹی بن چکا ہے، جو عالمی سطح پر بھی اپنی شناخت رکھتا ہے۔

جمنالال بجاج: شخصیت، فکر اور تعلیمی نظریات

سیٹھ جمنالال بجاج (۱۹۴۲-۱۸۸۹ء) راجستھان کے شہر وردھا کے ایک ممتاز صنعت کار، سماجی کارکن، مجاہد آزادی اور گاندھی جی کے خاص شاگرد تھے۔ ان کی زندگی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آبائی طور پر ان کا تعلق امیر گھرانے سے نہیں تھا بلکہ ان کے والدین بردی بائی اور کنی رام کا تعلق راجستھان ایک غریب کاشت کار، ویش گھرانے سے تھا۔[۱] ان کی پیدائش ۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو قدیم ریاست جے پور اور موجودہ ضلع سیکر، راجستھان کے ایک گاؤں 'کاشی کا باس' میں ہوئی۔[۲] پانچ سال کی عمر میں وردھا کے تاجر سیٹھ بچھراج بجاج نے انھیں اپنے پوتے کے طور پر گود لے لیا تھا۔ جمنالال کی اسی خوش قسمتی کا تذکرہ کرتے ہوئے کاکا کالیلکر لکھتے ہیں:

> "Jamnalal Bajaj was not born to wealth. But, early in life, he inherited a fortune left to him by the rich merchant who had adopted him as his grandson. He was born in a poor family in a waterless village, Kashi-ka-Bas, in the old Jaipur State, on November 4, 1889. He was only five when he became, through a miraculous chain of events, the grandson and

heir, by adoption, to Bachhraj Bajaj, a businessman and philanthropist from Sikar, a principality in Jaipur State, who had settled in Wardha."[۳]

جمنالال بجاج کی پیدائش دولت مند گھرانے میں نہیں ہوئی تھی۔ تاہم، زندگی کے ابتدائی دور ہی میں انھیں اس دولت کا وارث بننے کا موقع ملا، جسے ایک امیر تاجر نے، جنھوں نے انھیں اپنے پوتے کے طور پر گود لے لیا تھا، ان کے لیے چھوڑی تھی۔ ان کی پیدائش ایک غریب خاندان میں ایک بے آب وگیاہ گاؤں 'کاشی کا باس' میں ہوئی، جو اس وقت کی ریاست جے پور میں واقع تھا۔ وہ ۴/نومبر ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوئے۔ جب وہ صرف پانچ برس کے تھے تو واقعات کے ایک حیرت انگیز سلسلے کے نتیجے میں وہ باقاعدہ گود لیے جانے کے ذریعے بچھراج بجاج کے پوتے اور وارث قرار پائے۔ بچھراج بجاج سیکر کے ایک نامور تاجر اور مخیر شخص تھے، جو ریاست جے پور کی ایک ریاستی جاگیر تھی، بعد ازاں، وہ وردھا میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

تعلیم کے حصول کے لیے چھے سال کی عمر میں انھیں وردھا کے مراٹھی اسکول میں داخل کیا گیا، مگر ان کی تعلیم زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکی اور دس سال کی عمر میں ان کی رسمی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ جلد ہی انھیں اسکول سے نکال کر خاندانی تجارت میں تربیت کی غرض سے دوکان پر بٹھا دیا گیا۔[۴] جمنالال کی فطرت، ذہانت، بچپن کے حالات اور ان کے تعلق سے سیٹھ بچھراج بجاج کے رویے کا تذکرہ کرتے ہوئے بلرام نندا لکھتے ہیں:

"He was a shy, sensitive, intelligent and proud boy, and quickly learnt to read and write Marathi. Seth Bachhraj, who himself was practically unlettered, did not set much store by

formal education. The old Seth was getting on in years; his health was not too robust; he was in ahurry to initiate his grandson into the family business. So,Jamnalal, who had entered the school at the age of six, was taken out of it four years later."[۵]

وہ ایک شرمیلا، حساس، ذہین اور خوددار لڑکا تھا، اور اس نے جلد ہی مراٹھی پڑھنا اور لکھنا سکھ لیا۔ سیٹھ بچھراج جو خود بھی عملی طور پر غیر تعلیم یافتہ تھے، رسمی تعلیم کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ بوڑھے سیٹھ کی عمر ڈھل چکی تھی، صحت بھی زیادہ مضبوط نہ تھی، اور وہ اپنے پوتے کو جلد از جلد خاندانی کاروبار سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ جمنالال، جو چھے برس کی عمر میں اسکول میں داخل ہوا تھا، چار سال بعد وہاں سے نکال دیا گیا۔

دس سال کی عمر میں جمنالال کی منگنی چھے سال کی جانکی دیوی سے کردی گئی اور تین سال کے بعد ان کی شادی بڑے ہی تزک واحتشام کے ساتھ وردھا میں انجام پائی۔ اپنی منگنی اور شادی کا مفصل تذکرہ جانکی دیوی نے اپنی آپ بیتی 'میری جیون یاترا' میں بڑے ہی عمدہ انداز میں کیا ہے۔[۶]

جمنالال بجاج کی زندگی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کم عمری سے ہی خدمتِ خلق اور حب وطن کے جذبے سے سرشار ہو کر قومی وعوامی رہنماؤں سے تعلقات استوار کرنے شروع کردیے تھے۔ ان کے اسی جذبے نے ان کے لیے بہت سے قومی وملی رہنماؤں کی رفاقت فراہم کی اور انھیں ان رہنماؤں سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ وہ قومی رہنما، جن کی رفاقت نے جمنالال بجاج کی ابتدائی زندگی میں ان کی علمی وفکری صلاحیت کو متاثر کیا، ان میں دادابھائی نوروجی، پنڈت مدن موہن مالویہ، رابندرناتھ ٹیگور، لوک مانیہ تلک کے نام اہمیت کے ساتھ شمار کیے جاتے ہیں۔ بحیثیت ہم، فکری وعملی اعتبار سے وہ مہاتما گاندھی کے سچے پیروکار اور گاندھین فلسفے کے متبع تھے۔ اسی وجہ سے انھیں گاندھی جی کا گود لیا ہوا بیٹا بھی کہا جاتا ہے۔ اسی نقطہ نظر کو ٹی وی پروتے نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"He had already come to regard Gandhiji as his guru and follow him. But now he decided to 'adopt' Gandhiji as his 'father' and become his 'fifth son'. Gandhiji was at first surprised at this stage request, but he nevertheless agreed to it.Thus Jamnalal became Gandhiji's adopted son, and Gandhiji became his adopted father. The first adoption in the family of Seth Bachhraj was legal and made without the full knowledge and consent of the adoptee. This time the adoption was only moral, but consciously made by both parties and was highly consequential for the lives of both." [۵]

وہ پہلے ہی گاندھی جی کو اپنا 'گرو' مان چکے تھے اوران کی پیروی کرتے تھے، لیکن اب انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ خود گاندھی جی کا 'پانچواں بیٹا' بن کر انھیں بطور'باپ' اختیار کریں گے۔ ابتدا میں گاندھی جی اس غیر معمولی درخواست پر حیران ہوئے، مگر اس کے باوجود انھوں نے اسے قبول کر لیا۔ یوں جمنا لال، گاندھی جی کے منہ بولے بیٹے بن گئے اور گاندھی جی ان کے منہ بولے والد قرار پائے۔ سیٹھ بچھراج کے خاندان میں پہلی گود لینے کی رسم قانونی تھی اور اسے گود لیے جانے والے کی آگہی ورضامندی کے بغیر انجام دیا گیا تھا۔ اس مرتبہ یہ رسم محض اخلاقی نوعیت کی تھی، مگر فریقین کی شعوری رضامندی سے انجام دی گئی اور دونوں کی زندگیوں پر اس کے نہایت گہرے اور دوررس اثرات مرتب ہوئے۔

گاندھی جی کی تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ جمنالال بجاج نے اپنا سارا کاروباری اثر ورسوخ قومی تحریک کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ وہ نہ صرف مذہبی رواداری، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے

شیدائی؛تعلیم،سماجی اصلاح اور سادگی کے علمبردار بلکہ قومی اداروں کے لیے مالی قربانی دینے میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ جمنالال بجاج،اگرچہ روایتی اعتبار سے اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ تھے اور اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو'غیر تعلیم یافتہ جاٹ' کہا کرتے تھے۔[۹] مگر تعلیم کے فروغ کے لیے ان کی خدمات اور عطیات وامداد غیر معمولی رہی ہیں۔فروغ علم سے متعلق ان کے اولین عطیے کا تذکرہ کچھ اس انداز میں کیا گیا ہے:

> "How many people know or remember that one of the earliest donations of Jamnalal, who knew very little science, was towards the establishment of a research laboratory of the celebrated Indian botanist and biologist, Jagdish Chandra Bose?"[۱۰]
>
> کتنے لوگوں کو معلوم ہے یا انھوں نے یاد رکھا ہے کہ جمنالال،جنھیں سائنس کا بہت ہی کم علم تھا،ان کی ابتدائی عطیات میں سے ایک مشہور ہندوستانی ماہر نباتات وحیاتیات جگدیش چندر بوس کی ایک تحقیقی تجربہ گاہ کے قیام کے لیے تھا؟

مہاتما گاندھی کی قربت نے جمنالال بجاج کے اندر قومی وملی اداروں کی سرپرستی کو ایک اخلاقی ذمہ داری بنادیا۔گاندھی جی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بڑے محسنوں میں سے تھے،اس لیے جمنالال بجاج نے بھی اس ادارے کی سرپرستی اور معاونت کو اپنا فریضہ سمجھا۔ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد محض سرکاری ملازمت کا حصول نہیں بلکہ کردار سازی اور قومی شعور کی تعمیر تھا۔جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نصب العین اسی تصور کی عکاسی کرتا تھا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جمنالال بجاج

جامعہ ملیہ اسلامیہ، چونکہ تحریک ترکِ موالات کا نتیجہ تھی اور اس کا قیام تحریکِ خلافت کے

پس منظر میں عمل میں آیا تھا، اس لیے ابتدائی دور میں اس کے اخراجات کا بار مرکزی خلافت کمیٹی پر تھا۔ تاہم، جب ترکی میں خلافت کا خاتمہ ہوگیا تو برصغیر ہند میں بھی خلافت تحریک کا جوش سرد پڑ گیا۔ ایسی صورت میں مالی اعتبار سے جامعہ کی حالت دگرگوں ہونے لگی اور اس کا جاری رکھنا مشکل ہوا۔ جامعہ کے رہنماؤں نے اس کے لیے ایک قومی فنڈ قائم کیا تاکہ جامعہ کو کسی کا دست نگر نہ رہنا پڑے، مگر دشواریوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ ایسے حالات میں جب جامعہ بحرانی دور سے گزر رہی تھی اور اسے بند کیے جانے کی تجویز زیرِ غور تھی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور مہاتما گاندھی نے اصرار کیا کہ جامعہ کو ہر قیمت پر جاری رکھا جائے اور کمیٹی میں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کیا جائے۔[11]

دہلی میں جامعہ کی منتقلی کے بعد ابتداً اگرچہ اس کی پریشانیوں اور مالی مشکلات میں کمی واقع نہ ہوئی؛ تاہم، اسے کچھ ایسے معاونین اور ہمدرد ضرور میسر آ گئے، جن کے انسلاک نے نہ صرف اس کے استحکام اور ترقی میں معاونت کی بلکہ اس کی پریشانیوں کو بھی بڑی حد تک دور کیا؛ انہی معاونین اور ہمدردان میں ایک اہم نام سیٹھ جمنالال بجاج کا بھی ہے۔ دہلی میں جامعہ کی منتقلی کے بعد مہاتما گاندھی، جب پہلی مرتبہ جامعہ میں تشریف لائے تو جمنالال بجاج اور مہادیو دیسائی بھی ان کے ہمراہ تھے۔[12] تاریخی واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جمنالال بجاج کی جامعہ میں یہ پہلی تشریف آوری تھی، مگر قرین قیاس یہ ہے کہ گاندھی جی سے قربت، تحریک آزادی اور انڈین نیشنل کانگریس کے متحرک رکن کی حیثیت سے انھیں ابتدا ہی سے جامعہ اور اس کی کارگزاریوں کی آگہی ضرور تھی۔

جمنالال بجاج کی قومی یکجہتی اور ملکی تعلیمی نظام سے وابستگی کا ہی نتیجہ تھا کہ انھوں نے بلاتفریق مذہب وملت تمام ملکی تعلیمی اداروں کی مالی معاونت کی۔ انھوں نے جامعہ کو نہ صرف متعدد بار فوری اور بڑی رقوم فراہم کیں بلکہ اس کی سالانہ مالی سرپرستی بھی قبول کی۔ جامعہ سے جمنالال بجاج کے تعلق اور اس کی مالی معاونت کے بارے میں عبدالغفار مدھولی اپنی کتاب 'جامعہ کی کہانی' میں لکھتے ہیں:

> ''جامعہ کے سابق خازن مسٹر جمنالال بجاج کا انتقال ہوا، آپ جامعہ کے قدیم ہمدردوں میں سے تھے، جامعہ میں ایک عرصے تک غریب طلباء کے وظائف کے لیے خاصی رقم آپ کی طرف سے جمع رہتی تھی، جب

جامعہ کی عمارت بننے لگی تو آپ نے ۱۶ رہزار روپے اسی غرض سے دیے
تھے۔''[۱۳]

عبدالغفار مدھولی کی مذکورہ بالاتحریر سے اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ جامعہ سے سیٹھ جمنالال بجاج کا تعلق نہ صرف قدیم بلکہ بہت ہی مضبوط تھا، اسی وجہ سے انھوں نے ہر موقع پر جامعہ کی مالی مدد کی۔ان کا ایک اہم کام جامعہ میں غریب ونادار طلبہ کی مالی معاونت کے لیے مستقل ایک فنڈ کا قیام تھا تا کہ اس کے ذریعہ معاشرے کے کم زور طبقے کے تشنگانِ علم کی مدد ہوتی رہے۔مذکوہ بالا اقتباس میں سیٹھ جمنالال بجاج کے انتقال کو جامعہ کے قیام کے انیسویں سال یعنی ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں درج کیا گیا ہے، جب کہ دوسرے تاریخی حوالے، خاص طور پر وہ کتابیں، جو جمنالال بجاج کی سوانح اور ان کے کارناموں سے متعلق ہیں، ان میں جمنالال بجاج کی تاریخ وفات ۱۱ رفروری ۱۹۴۲ء درج ہے۔[۱۴]

جامعہ کی مالی معاونت اور امداد کے حوالے سے اگر ان مدوں کی فہرست سازی کی جائے کہ وہ کون سے اہم امور اور شعبہ جات ہیں، جن میں سیٹھ جمنالال بجاج نے جامعہ کی معاونت فرمائی تو ان میں درج ذیل اہم مد شمار کیے جاسکتے ہیں:

- اساتذہ کی تنخواہوں کی ادائیگی
- طلبہ کے وظائف
- جامعہ کی عمارتوں کی مرمت وتعمیر
- نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں کے لیے فنڈ

جمنالال بجاج کے خطوط اور ان کی سوانح کے مطالعہ سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جامعہ کو صرف مالی تعاون نہیں دیا بلکہ اس کے استحکام اور فروغ کے لیے مختلف قسم کی کاوشیں بھی کیں۔ملکی عوام کو جامعہ سے متعارف کرانے اور اس کی مدد ومعاونت کے لیے اپلیں بھی شائع کیں۔ حکیم اجمل خاں کی وفات کے بعد سیٹھ جمنالال بجاج اور دوسری اہم شخصیات کی طرف سے کی گئی اسی قسم کی ایک اپیل کا تذکرہ رسالہ جامعہ میں اس طرح کیا گیا ہے:

''خدا کے فضل سے دواخانہ اور طبیہ کالج کی مالی حالت اچھی ہے۔خطرہ
اگر تھا تو جامعہ ملیہ کے لیے۔لیکن الحمدللہ اس معاملے میں غفلت نہیں کی گئی

بلکہ ڈاکٹر انصاری صاحب نے اپنے قیام مدراس ہی کے زمانے میں یہ
اپیل شائع کردی کہ مسیح الملک مرحوم کی یادگار میں ایک فنڈ قائم کیا جائے،
جس کا مقصد جامعہ ملیہ کو مالی اعتبار سے مستحکم کرنا ہو۔ایک بیان سری نواس
آئنگر، پنڈت جواہرلال نہرو اور جمنالال بجاج کی طرف سے شائع ہوا کہ
تمام ملک کو اس وقت جامعہ ملیہ کی مدد کرنا چاہیے۔''[۱۵]

جمنالال بجاج اور جامعہ ملیہ کے رشتے کی ایک دوسری نوعیت جامعہ سے ان کا عملی انسلاک شمار کیا جاسکتا ہے۔جامعہ کی تاریخ اور جمنالال بجاج کی زندگی کا مطالعہ شاہد ہے کہ انھوں نے جامعہ کو صرف سرمایہ فراہم نہیں کیا بلکہ جامعہ کے ایک اہم اور ابتدائی منتظم کی حیثیت سے اس کی عملی خدمت بھی کی۔جامعہ کے انتظامی اجلاسوں میں فعال کردار ادا کیا، پالیسی سازی میں مشورے دیے اور وسیع حلقوں میں جامعہ کے لیے حمایت حاصل کی۔

جمنالال بجاج نے نہ صرف جامعہ کی فکری، اخلاقی اور مالی معاونت کی بلکہ جامعہ سے ان کی ملی وابستگی بھی رہی۔وہ ایک لمبی مدت تک جامعہ کی مجلس امناء اور مجلس منتظمہ کے رکن رہے۔انھوں نے جامعہ کے خازن کی حیثیت سے بھی ایک مدت تک خدمات انجام دیں۔حکیم اجمل خاں کے اس دارفانی سے کوچ کر جانے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کو استحکام بخشنے، ترقی دینے اور مالی دشواریوں سے آزاد کرنے کے لیے جامعہ کی مجلس تاسیسی نے ۲۹/اپریل ۱۹۲۸ء کے اپنے اجلاس میں جس مجلس امناء و مجلس منتظمہ کا انتخاب کیا، ان دونوں میں جمنالال بجاج کا نام شامل تھا۔[۱۶]

جمنالال بجاج کے عملی اقدامات

اپریل ۱۹۲۸ء میں جامعہ کا خازن منتخب ہونے کے بعد جمنالال بجاج نے جامعہ کے لیے مستقل مالی ڈھانچے کی تشکیل کی راہ ہموار کی۔جمنالال بجاج کے بعد خازن کے عہدے پر ۸/دسمبر ۱۹۳۸ء کو پروفیسر محمد مجیب منتخب ہوئے۔[۱۷] اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جمنالال بجاج نے بطور خازن دس سال سے کچھ زیادہ عرصے تک کام کیا۔اس عہدے پر رہتے ہوئے انھوں نے بہت سے عملی اقدامات کیے تاکہ ان کے ذریعہ جامعہ کو مالی پریشانیوں سے نجات مل سکے۔ان اقدامات میں

جامعہ کے اغراض ومقاصد سے اہلِ وطن کو روشناس کرانا، چندہ مہمات، قومی رہنماؤں کی حمایت کا حصول اور سرمایہ داروں وصنعت کاروں کے تعاون کی ترغیب شامل ہیں۔

ان عملی اقدامات کی تعمیل کی غرض سے جامعہ کے ذمہ داروں نے ملک کے مختلف علاقوں کے دورے کیے اور جامعہ کے اغراض ومقاصد سے عوام الناس کو روشناس کرایا، مستقبل میں جس کے خاطر خواہ فائدے بھی ملے۔ ان کوششوں کے ذریعہ لوگوں کے ذہن میں جامعہ کے تعلق سے غلط فہمیوں کا نہ صرف ازالہ ہوا اور طلبہ کی تعداد بڑھی بلکہ جامعہ کی مالی امداد میں بھی بڑے پیانے پر اضافہ ہوا۔ انہی عملی اقدامات پر اطمینان اور خوشی کا اظہار رسالہ جامعہ کے ایک شمارے میں اس طرح کیا گیا ہے:

> ''ہمدردانِ جامعہ کا حلقہ وسیع کرنے کی جو تحریک جامعہ نے چند ماہ سے شروع کی ہے، اس میں بحمد اللہ، حسبِ توقع کامیابی ہو رہی ہے اور ملک کے ہر حصے سے تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس تحریک کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ اگر یہ رفتار قائم رہی تو ہمیں امید ہے کہ بہت جلد ہماری مالی مشکلات ختم ہو جائیں گی اور ہم سکون واطمینان سے اپنی تعمیری تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں مشغول ہو جائیں گے۔''[۱۸]

جمنالال بجاج کو بین المذاہب ہم آہنگی کی عملی مثال شمار کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی سرگرمیوں کے ذریعہ یہ ثابت کیا قوم و مذہب سے بالاتر ہو کر تعلیم اور خدمت خلق کا رشتہ سب سے اہم ہے۔ اگر چہ بجاج نے براہِ راست نصاب تعلیم تشکیل نہیں دی لیکن گاندھی کے فلسفۂ تعلیم، بچوں کی اخلاقی تربیت، ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور دیہی صنعتوں کے فروغ کے حوالے سے ان کے نظریات نے جامعہ کے ماحول کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ ان کی سرپرستی نے اساتذہ میں اعتماد پیدا کیا کہ ادارہ مالی طور پر بحال رہے گا، جس کے نتیجے میں معیاری تدریس، تحقیقی سرگرمیوں اور علمی خود اعتمادی میں اضافہ ہوا۔ طلبہ میں یہ احساس مضبوط ہوا کہ ان کا ادارہ قومی تحریک کا حصہ ہے اور اس کی سرپرستی قومی رہنماؤں کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے ان کے اندر قومی خدمت کا جذبہ مضبوط ہوا۔

یہ حقیقت ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد مسلمان قومی رہنماؤں نے رکھی لیکن اس کی بقا کے مختلف مراحل میں غیر مسلم رہنماؤں کی مدد فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ جمنالال بجاج کی حمایت اور امداد کی

وجوہات میں درج ذیل محرکات کو شمار کیا جاسکتا ہے:

- جمنالال بجاج کا مہاتما گاندھی سے تعلق اور محبت
- ایک قومی فرض
- قومی یکجہتی کا فروغ

بہر حال، جمنالال بجاج کی معاونت کے جو بھی محرکات رہے ہوں، مگر تاریخی طور پر اس سچائی کا اعراف کرنا ضروری ہے کہ انھوں نے جامعہ کی بے لوث خدمت کی، ساتھ ہی ان کے عملی اقدامات خلوص پر مبنی تھے۔ ان کے عملی اقدامات نے اس تعلیمی وتحریکی ادارے کو نہ صرف استحکام بخشا بلکہ اس کے مالی ڈھانچے کو مضبوط بھی کیا۔ جامعہ کی تاریخ میں جمنالال بجاج کا کردار اس بات کی روشن مثال ہے کہ قومیں باہمی تعاون سے بنتی ہیں، نہ کہ مذہبی تفریق سے۔ مہاتما گاندھی، بجاج اور ان جیسے دوسرے قومی رہنماؤں کے زیرِ اثر جامعہ میں سادگی، دستکاری، خود کفالتی کی تعلیم کو اہمیت حاصل ہوئی۔ انہی رہنماؤں کے زیرِ اثر جامعہ میں نہ صرف فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی روایت قائم ہوئی بلکہ جامعہ آج بھی ایک کثیر ثقافتی اور کثیر مذہبی ادارہ ہے۔ جامعہ کی اس روایت کو انہی مسلم وغیر مسلم سرپرستوں کی عملی کاوشوں اور دعاؤں کا ثمرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

ماحصل

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ اس عظیم ادارے کے قیام، بقا اور تعمیر میں جہاں مسلم رہنماؤں نے قربانیاں دیں، وہیں چند روشن خیال غیر مسلم رہنماؤں نے بھی اسے اپنا قومی فرض سمجھ کر اس کی مدد کی۔ ان میں جمنالال بجاج کا کردار نمایاں اور فیصلہ کن شمار کیا جاتا ہے۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو نہ صرف مالی امداد فراہم کی بلکہ اپنی شخصیت، اثر ورسوخ اور گاندھی کے نظریات کے ذریعے اس ادارے کو ایک مضبوط فکری سمت عطا کی۔ ان کے تعاون کے بغیر جامعہ کا موجودہ وجود شاید ممکن نہ ہوتا۔ جامعہ کی تعمیر وترقی میں جمنالال بجاج کا کردار تاریخی، تعلیمی اور سماجی غرض کہ ہر اعتبار سے مثالی اور ناقابلِ فراموش شمار کیا جاتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

1. B R Nanda: In Gandhi's footsteps - The life and times of Jamnalal Bajaj, Oxford University Press, Delhi, 1990, P 7
2. Kaka Kalelkar: (edit) To A Gandhian Capitalist - Correspondence between Mahatma Gandhi and Jamnalal Bajaj and members of his family, SevakPrakashan Bombay, Second revised and enlarged edition, August 1979,P 24; B R Nanda: In Gandhi's footsteps - The life and times of Jamnalal Bajaj, P 8
3. Kaka Kalelkar: (edit) To A Gandhian Capitalist - Correspondence between Mahatma Gandhi and Jamnalal Bajaj and members of his family, P 24

۴۔ حوالہ سابق،ص:۲۵

5. B R Nanda: In Gandhi's footsteps - The life and times of Jamnalal Bajaj, P 8

۶۔ میری جیون یاترا — جانکی دیوی بجاج، ست ساہتیہ پرکاشن (نئی دہلی)،۱۹۵۶ء،ص:۲۵-۱۷

7. Kaka Kalelkar: (edit) To A Gandhian Capitalist - Correspondence between Mahatma Gandhi and Jamnalal Bajaj and members of his family, P 27
8. T V Parvate: Jamnalal Bajaj - A brief study of his life and character, Navajivan publishing house, Ahmadabad, 1960, P 16-17

۹۔ حوالہ سابق،ص:۶

۱۰۔ حوالہ سابق

۱۱۔ معمارانِ جامعہ — ظفر احمد نظامی:،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (دہلی)۲۰۱۱ء،ص:۸۵

۱۲۔ جامعہ کی کہانی — عبدالغفار مدہولی،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی)۲۰۰۴ء،ص:۹۸

۱۳۔ حوالہ سابق،ص:۲۵۷

14. T V Parvate: Jamnalal Bajaj - A brief study of his life and character, P 153;B R Nanda: In Gandhi's footsteps - The life and times of Jamnalal

Bajaj, P 367;Kaka Kalelkar: (edit) To A Gandhian Capitalist - Correspondence between Mahatma Gandhi and Jamnalal Bajaj and members of his family, P 58

۱۵۔ رسالہ جامعہ [جلد:۱۰،شمارہ:۱] جنوری ۱۹۲۸ء،ص:۷۵

۱۶۔ رسالہ جامعہ [جلد:۱۰،شمارہ:۵] مئی ۱۹۲۸ء،ص:۹۷-۷۷؛عبدالغفار مدہولی: جامعہ کی کہانی،ص:۱۰۹-۱۰۶

۱۷۔ ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک– جامعہ ملیہ اسلامیہ —شمس الرحمٰن محسنی،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (نئی دہلی) دسمبر ۱۹۸۶ء،ص:۵۷

۱۸۔ رسالہ جامعہ [جلد:۲۰،شمارہ:۲] فروری ۱۹۳۳ء،ص:۱۹۸

ڈاکٹر جاوید اختر *

جامعہ ملیہ اسلامیہ

بانیانِ ومعماران کے نظریات کی روشنی

جامعہ ملیہ اسلامیہ ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کوتحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون[1] کے تاریخی پس منظر میں منصۂ شہود پر آئی۔ آج، ۲۰۲۵ء میں یہ ادارہ اپنے یوم تاسیس کے ۱۰۵ سال مکمل ہونے کا جشن منا رہا ہے۔ درحقیقت ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ 'جامعہ'، 'ملیہ' اور 'اسلامیہ' کے تین الفاظ اپنی جگہ گہرا تاریخی وفکری پس منظر رکھتے ہیں۔ پروفیسر مشیر الحق[2] ان الفاظ کی معنویت اور مقصدیت کو خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عابد حسین کی کتاب ''ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں'' کے ابتدایئے میں لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان اور جرمنی کی جامعات سے اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد ذاکر حسین، محمد مجیب اور عابد حسین نے اپنا رشتہ ہمیشہ کے لیے ایک ایسے تعلیمی ادارے سے جوڑ لیا تھا جس کی حقیقت تین الفاظ میں پوشیدہ ہے یعنی 'جامعہ'، 'ملیہ'، اور 'اسلامیہ' بظاہر یہ صرف تین الفاظ ہیں لیکن یہ تینوں مل کر تاریخی حقائق کا ایسا بحر ذخار بن جاتے ہیں کہ اس کی تہہ میں اترے بغیر گہر معانی حاصل نہیں ہوسکتا۔ پہلے تو یہ 'جامعہ' ہے یعنی ایک دانش گاہ، ایسی

اسسٹنٹ پروفیسر (C)، اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ ای میل: javed.akhatar1985@gmail.com

روایتی دانش گاہ نہیں جس کا وجود شماریات پر منحصر ہوتا ہے کہ اس نے ہر سال کتنے 'اَن پڑھوں' کو 'پڑھا' بنادیا بلکہ ایک ایسی دانش گاہ جہاں 'انگھڑ' گھڑے جاتے ہیں۔ ان کے ذہن کو جلا دی جاتی ہے اور انھیں کام کا بنایا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ 'ملیہ' بھی ہے۔ 'ملیہ' کی اہمیت صرف انہی ملکوں میں پوری طرح سمجھی جاسکتی ہے جہاں مختلف مذاہب، مختلف زبان اور مختلف تہذیبی ورثوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بستے ہوں اور انھیں اپنی انفرادیت کو باقی رکھتے ہوئے ایک ایسا گلدستہ بن جانے کے مواقع حاصل ہوں کہ وہ الگ الگ رہتے ہوئے بھی ایک معلوم ہوں۔ جیسے کہ ہمارا اپنا ملک ہے۔ تیسرا لفظ 'اسلامیہ' اسی بات کی مسلسل یاد دہانی کے لیے جامعہ کے ساتھ مربوط ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نشان منزل نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ جامعہ انہی تینوں کے مجموعے کا نام ہے۔''[۳]

بانیان ومعمارانِ جامعہ نے ذاتی مفادات کے تحت یا کسی وقتی جوش وخروش سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ جانتے بوجھتے اور شعوری طور پر جامعہ کا دامن تھاما اور اپنی پوری زندگی اس نئے ادارے کے مشن کے لیے وقف کردی۔[۴]

اس تحقیقی مقالے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے؛ ''بانیانِ جامعہ'' اور ''معمارانِ جامعہ''، پہلے حصے میں دونوں اصطلاحات کے مفاہیم کو واضح کیا گیا ہے۔[۵] دوسرے حصے میں بانیان ومعماران جامعہ یعنی مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر سید عابد حسین کی تعلیمی فکر اور ادارہ جاتی تصور کی بنیاد پر جامعہ کے پس منظر، اس کی تفہیم اور فکری تشکیل کا علمی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اگر چہ اس مضمون میں شامل کیے جانے کے لیے دیگر نام بھی اہمیت رکھتے ہیں، تاہم اس مقالے میں صرف ان چار ممتاز شخصیات کا انتخاب دو بنیادی وجوہات کی بنا پر کیا گیا ہے۔ اولاً اس مضمون کے علمی وفکری مقاصد ان ہی شخصیات کے افکار ونظریات کے ذریعے بخوبی پورے ہو جاتے ہیں۔ ثانیاً، تحریر کو غیر ضروری طوالت سے بچاتے ہوئے جامع، بامعنی اور مرکزی نکتہ نظر پر مرکوز رکھنا مقصود ہے، تاکہ قارئین تک مضمون کی اصل روح مؤثر انداز میں پہنچ سکے۔ مجموعی طور پر اس مقالے میں راقم نے نہ

صرف جامعہ ملیہ کی روح کو ان شخصیات کی نظریاتی زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، بلکہ اس کی تاریخی معنویت اور فکری بنیادوں کو بھی اُجاگر کیا ہے۔

بانیانِ ومعماران جامعہ

وہ شخصیات جنھوں نے جامعہ ملیہ کے قیام کے مشن میں براہِ راست حصہ لیا، اس کے قیام کے لیے عملی جدوجہد کی فکری رہنمائی فراہم کی اور قیادت کے جوہر دکھائے، وہ دراصل بانیان جامعہ ہیں۔ انہی کے عزم واستقلال نے اس تعلیمی تحریک کو ایک مضبوط بنیاد عطا کی۔ اس کے برعکس وہ اہل علم و فکر جنھوں نے اس ادارے کے قیام کے بعد اس کے فکری و تعلیمی ڈھانچے کو مستحکم کیا، اس کی ادارہ جاتی تنظیم وانتظام کو نئی جہتیں دیں، اور اسے ترقی و وقار کی راہوں پر گامزن کیا، وہ معماران جامعہ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کے عملی کارنامے اور فکری خدمات ہی نے جامعہ کو ایک منفرد علمی وتہذیبی شناخت عطا کی۔ ظفر احمد نظامی نے اپنی کتاب ''معمارانِ جامعہ: جامعہ ملیہ اسلامیہ'' میں نہایت وضاحت اور علمی بصیرت کے ساتھ ان دونوں اصطلاحات کے مفاہیم اور دائرہ کار کو متعین کیا ہے۔ وہ ان دونوں اصطلاحات کے تعارف کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جامعہ کے افتتاحی جلسہ میں جو رہنمایان قوم شریک تھے اور جنھوں نے جامعہ کے قیام کے سلسلہ میں عملی کوششیں کی تھیں وہ بانیان جامعہ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ان میں شیخ الہند مولانا محمود حسن، حکیم حافظ محمد اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری علی، برادران، عبدالمجید خواجہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین شامل ہیں۔ مہاتما گاندھی نے چونکہ ترکِ موالات کی چنگاری کو ہوادی تھی اور جامعہ کے قیام کے لیے ایم اے او کالج کے طلبہ سے اپنی مادر علمی کو خیر باد کہنے کے سلسلے میں پہل کی تھی اس لیے ان کا نام بھی بانیاں جامعہ میں شامل کیا جانا چاہیے۔''[٦]

وہ مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہے:

> ''ان کے علاوہ ڈاکٹر عابد حسین پروفیسر محمد مجیب اور شفیق الرحمٰن قدوائی

جامعہ کے معماروں میں شامل ہیں۔ اگر چہ فہرست میں اور بھی نام شامل
کیے جاسکتے ہیں لیکن راقم الحروف نے اس کہکشاں میں صرف ان ہی
درخشندہ ستاروں پر اکتفا کیا ہے جو ان صفحات کی زینت ہیں۔''[۷]

خلاصہ یہ ہے کہ بانیان جامعہ وہ شخصیات ہیں جنھوں نے جامعہ ملیہ کے قیام کی بنیاد رکھی اور اس کے وجود میں آنے میں عملی کردار ادا کیا، جب کہ معماران جامعہ وہ اہل فکر و علم ہیں جنھوں نے جامعہ کی فکری، تعلیمی اور ادارہ جاتی تعمیر و ترقی میں نمایاں خدمات انجام دیں اور اسے استحکام و وقار کی منزل تک پہنچایا۔

اب یہاں سے ہم اپنے بحث کے اصل اور مرکزی حصے میں داخل ہوتے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ

مولانا محمد علی جوہر[۸] نے اپنے ہفت روزہ ''ہمدرد'' کے صفحات پر پانچ قسطوں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے متعلق اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ پیش کیے تھے۔[۹] ان تحریروں کے ذریعے انھوں نے جامعہ کے تعلیمی مشن اور اس کے مقاصد کو عوام کے سامنے واضح کیا، جن پر وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں بار بار زور دیتے رہے تھے۔ اگر ہم مولانا جوہر کے ان پانچوں مضامین کا تنقیدی مطالعہ کریں تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بنیادی تصور و فکر کا ایک جامع اور واضح خاکہ ہمارے سامنے ابھر آتا ہے۔

صحیح نظریۂ تعلیم کا قیام

جامعہ پر اپنے طویل مضمون کی پہلی قسط میں آپ لکھتے ہیں کہ جامعہ کا ہمیشہ سے ایک خاص مقصد ہے اور وہ خود اس قدر جامع اور واضح ہے کہ اس کی کسی تشریح و تاویل کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جامعہ نے ابتدا ہی سے پیش نظر جو مقصد رکھا وہ یہ ہے کہ یہاں سے مسلمان اور محبِ وطن ہندستانی پیدا ہوں۔ رہا اس کا تعلیمی پروگرام اور اسکیم وہ بھی بالکل متعین اور ایسی ہے جو اس مقصد کے لیے معاون ثابت ہو۔

''جامعہ نے تعلیم کے متعلق صحیح نظریہ قائم کیا اور تلامذہ کے قوائے داخلی کو
ترقی دینے کا کام اپنے ذمہ لیا اور اس کو ہرگز پسند نہ کیا خواہ تعلیم دنیوی ہو یا

دینی کہ وہ محار (بے مغز) کی طرح ہو۔ جامعہ نے سب سے پہلے تعلیم کے بارے میں ایک متوازن اور جامع نظریہ قائم کیا۔ اس نے تعلیم کو محض ظاہری آرائش یا رسمی حیثیت دینے کے بجائے اسے انسانی شخصیت کی داخلی قوتوں کی نشوونما کا ذریعہ قرار دیا۔ یعنی تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ طالب علم محض معلومات کا ذخیرہ جمع کرے، بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی عقل وجدان، کردار اور روحانی صلاحیتوں کو ترقی دے۔ یہی مفہوم اس جملے میں پوشیدہ ہے کہ جامعہ نے تعلیم کو ''مثل المحار'' بننے سے روکا، یعنی وہ تعلیم جو محض خول ہو، جس میں باطنی معنویت اور مقصدیت نہ ہو، جامعہ کے نزدیک قابل قبول نہیں۔''[۱۰]

تعلیمی فلسفہ کی تشکیل محض اتفاقی یا سطحی عمل نہیں، بلکہ فکری دیانت اور اخلاقی مقصدیت پر مبنی ایک شعوری کاوش ہے۔ اس سے مراد صرف تدریسی نظم ونسق یا نصاب سازی نہیں بلکہ ایک ایسے ہم آہنگ فکری نظام کی پرورش ہے جو علم و کردار اور سماجی ذمہ داری کو باہم مربوط کرے۔ مولانا محمد علی کی فکری روایت کے تناظر میں صحیح فلسفۂ تعلیم (sound philosophy of education) اس زندہ اور متحرک ہم آہنگی کا نام ہے جو روحانی و مادی جہات کو باہم ملا کر فرد کی باطنی صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے ساتھ ساتھ تعلیم کو معاشرے کی اخلاقی وتہذیبی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرتی ہے۔

وہ مزید لکھتے ہے:

''تعلیم کے دو بنیادی مقاصد ہونے چاہیے۔ اس کا پہلا مقصد یہ ہو کہ ہندستان کے مسلمانوں کو حق دوست اور حق پرست مسلمان (an ideal Muslim) بنائے اور دوسرا مقصد یہ ہو کہ ان کو وطن دوست وحریت پرور ہندستانی (a true Indian patriotic) بنائے۔''[۱۱]

یعنی جامعہ کے قیام کے وقت اس کے دو نمایاں تعلیمی مقاصد طے کیے گئے۔ پہلا مقصد ایسے مسلمانوں کی تیاری تھا جو دینی شعور، اخلاقی استقامت اور سچائی سے وابستگی کے حامل ہوں۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ مسلمان محض مذہبی دائرے تک محدود نہ رہیں بلکہ وہ اپنے وطن کے وفادار شہری اور آزادی کے

علمبردار بھی بنیں۔ یہ دونوں مقاصد ایک دوسرے کے متعارض نہیں بلکہ ایک دوسرے کے تکمیلی پہلو ہیں، جو دین و وطن دونوں کے حقوق ادا کرنے والے انسان کی تشکیل کرتے ہیں۔

مولانا جوہر کا ایک اور مضمون جامعہ کی ایک اور خصوصیت اللہ پرستی، ملت پروری اور وطن دوستی" کے عنوان سے جو 'ہمدرد' کے ۱۸ر جنوری ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا، کی عکاس ہے۔ اس میں بھی انھوں لکھا کہ جامعہ اپنے طلبہ کو دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ ہم آہنگی اور رواداری کے ساتھ رہنے کی تعلیم دیتی ہے:

''جامعہ کے بانیوں نے اس امر کو بھی ملحوظ رکھا کہ جس ہندستان میں ہم مسلمان کروڑ کی تعداد میں رہتے ہیں اس میں اور ملتیں بھی آباد ہیں۔ اگر ہمارے کچھ حقوق ہیں تو ان کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ اگر ہمارے حقوق کی حفاظت کی جانی چاہیے تو ان کے بھی حقوق اسی تحفظ کے متقاضی ہیں۔ اگر ہماری ناحق دلآزاری جرم ہونی چاہیے تو ان کی ناحق دلآزاری بھی جرم ہونی چاہیے۔ بہر حال اسلام دنیا میں دلآزاری سے نہیں پھیلایا جاسکتا اور تسخیر ملوک مسلمانوں کا شعار نہیں ہے بلکہ تسخیر قلوب ہے۔ چنانچہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سات سوا سات برس کی زندگی خود اس کا ثبوت ہے کہ اس نے جہاں اپنی خدا پرستی اور ملت پروری کو اپنا شعار بنایا وہیں اس نے وطن دوستی کو بھی اپنے طلبہ کی زندگی کا ایک ولولہ انگیز جذبہ سمجھا اور اس کو ہمیشہ ابھارا۔''[۱۲]

ہندو مسلم اتحاد

اس کے بعد مولانا محمد علی جوہر نے جامعہ ملیہ کو ایک نیشنل یونیورسٹی کے طور پر پیش کیا اور اسے مذہبی اور قومی شعور کے امتزاج کی علامت بتایا۔ مولانا اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہندستان کے مسلمان اپنی اسلامی شناخت کے ساتھ ساتھ ایک متحدہ قومی شناخت کے بھی حامل ہیں۔[۱۳] جامعہ کے بانیوں نے محسوس کیا کہ آزادی وطن کے لیے ہندو مسلم اتحاد ناگزیر ہے، اسی لیے جامعہ نے اپنی فضا کو تعصب اور غلو

سے پاک رکھتے ہوئے ہر اس فرد کے لیے دروازے کھول دیے جو وطن سے محبت رکھتا ہو۔ اس طرح جامعہ کی اساس مذہبی تنگ نظری کے بجائے اخلاقی و انسانی اقدار پر رکھی گئی جو اسے حقیقی معنوں میں ایک قومی و ہمہ گیر تعلیمی ادارہ بناتی ہے۔ وہ لکھتے ہے:

> ''یاد رکھنا چاہیے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک نیشنل یونیورسٹی ہونے کا بھی دعوی کرتی ہے۔ ہم ہندستان کے مسلمان مسلمان ضرور ہیں مگر ہندستانی بھی ہیں۔ اس میں صرف مسلمان ہی آباد نہیں بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی ان کے ساتھ ساتھ اس ملک میں آباد ہیں اور ان کے ہمسایہ اور پڑوسی ہیں اور انھیں کی کثرت ہے۔ جامعہ کے بانیوں پر یہ حقیقت آشکار ہو چکی تھی کہ اس ملک کی آزادی کے لیے[۱۴] مسلمانان ہندستان کا اپنے ہمسایہ بھائیوں کے ساتھ اتحاد و ارتباط قائم کرنا لازمی و لابدی ہے اس لیے ایک طرف تو جامعہ نے اپنا دروازہ ہر اس ہندستانی کے لیے کھول دیا جس کو جامعہ کی فضا میں رہنے اور وہاں تعلیم حاصل کرنے کے خلاف تعصب نہ ہو۔ دوسرے جامعہ کے ہر طالب علم کے دل میں خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ملک کی محبت اور اغیار و اجانب کی غلامی سے نفرت پیدا کرنا جامعہ نے پہلے ہی دن سے اپنا وظیفہ سمجھا اور جامعہ کی فضا کو غلو اور تعصب سے پاک صاف رکھا، اس لیے حقیقی معنوں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک نیشنل یونیورسٹی ہے۔''[۱۵]

دینی و دنیوی علوم کا امتزاج

جامعہ نے اپنے نام ہی سے اپنے مقصد کو ظاہر کیا ہے۔ ''جامعہ'' یعنی ایسا تعلیمی ادارہ جو علوم دین و دنیا دونوں کو یکجا کرتا ہے۔ ''ملیہ'' یعنی وہ ادارہ جو قوم و ملت کے مفاد میں قائم کیا گیا ہو۔ یہ ادارہ نہ صرف مذہبی علوم پڑھاتا ہے اور نہ محض دنیاوی علوم پر اکتفا کرتا ہے، بلکہ اس نے دونوں کے درمیان ایک معتدل راستہ اختیار کیا، جہاں علم کا مقصد محض معاشی فائدہ نہیں بلکہ اخلاقی و روحانی ارتقا بھی ہے۔

مولانا لکھتے ہے:

''جامعہ ملیہ اسلامیہ پہلے تو 'جامعہ' اور 'ملیہ' ہے یعنی اس میں علوم دین و دنیا دونوں پڑھائے جاتے ہیں اور نہ تو وہ دیو بند اور مدرسہ نظامیہ وغیرہ کے طرز پر صرف علوم دینی کی تعلیم دیتی ہے نہ انگریزی کالجوں کی طرح صرف علوم دنیوی پر اکتفا کرتی ہے۔ پھر یہ 'جامعہ ملیہ اسلامیہ' ہے یعنی اس کی تعلیم اسلام کی تعلیم ہے گو دیگر مذاہب کے پیروؤں کے لیے اس کا دروازہ بند نہیں ہے۔ وہ اسلام کو صحیح تفسیر حیات سمجھتی ہے اور اسلام کے اصولوں کی اس لیے تعلیم دیتی ہے کہ وہ اسرار زندگی سے انسان کو آگاہ کرتے ہیں۔''[۱۶]

مولانا جامعہ کو اسلام کے ہم معنی قرار دیتے ہیں اور اس کی یہ توجیہ پیش کرتے ہیں کہ جس طرح اسلام میں دین و دنیا کی تفریق نہیں، اسی طرح جامعہ بھی تعلیم کے میدان میں دینی تعلیم اور دنیاوی تعلیم کو ایک دوسرے سے جدا نہیں سمجھتی۔ جامعہ کا نظریہ یہ ہے کہ دینی اور دنیوی تعلیم ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں، اسی لیے جامعہ میں دونوں کی تعلیم ہم آہنگی کے ساتھ دی جاتی ہے۔

جامعہ نے اپنی بنیاد اسلام کے اصولوں پر رکھی، لیکن یہ بھی واضح کیا کہ اس کے دروازے دیگر مذاہب کے پیروکاروں پر بند نہیں۔ اس کا تعلیمی نظریہ یہ تھا کہ اسلام صرف ایک مذہب نہیں بلکہ ایک جامع اسلامی تفسیر حیات (comprehensive interpretation of life) ہے۔ اسلامی تعلیم کے ذریعے انسان کو ''اسرار زندگی''، یعنی حیات کے حقیقی معنوں سے آگاہ کرنا جامعہ کا نصب العین ہے۔

حقیقی اخلاقی اور روحانی تربیت

جامعہ ملیہ کی روح اساس درحقیقت اخلاقی و روحانی تربیت ہے۔ جامعہ کی تعلیم اسلام کی تعلیم ہے۔ یہ تعبیر جامعہ کے اس جوہر اساسی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے کہ یہاں تعلیم کا مقصد فقط معلومات کا حصول یا پیشہ ورانہ مہارتوں کی فراہمی نہیں، بلکہ اسلام کے مثالی تصورات کی روشنی میں ایک اخلاقی و روحانی نظم تربیت کی تشکیل ہے۔ اس ضمن میں مولانا محمد علی جوہر لکھتے ہے:

”جامعہ ملیہ اسلامیہ کی روح حقیقی اخلاقی اور روحانی تربیت پر مبنی ہے۔ یہ تصور تعلیم محض علم کے حصول تک محدود نہیں بلکہ انسان کی باطنی تطہیر، کردار کی تعمیر اور روح کے ارتقاء کا ذریعہ ہے۔ اس کے نزدیک تعلیم کا مقصد ذہن کو بصیرت کے ساتھ اور عقل کو ایمان کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہے، تا کہ علم محض معلومات کا ذخیرہ نہ رہے بلکہ ایک ایسی اخلاقی قوت بن جائے جو انسان کو حق، عدل اور خدمت انسانیت کی راہ پر گامزن کرے۔“[۱۷]

عربی زبان اور قرآن کریم کی مرکزیت

’ہمدرد‘ کے ۸/ جنوری ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں مولانا محمد علی کا دوسرا مضمون بعنوان ”جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے کیا؟“ شائع ہوا۔ اس میں مولانا نے پہلے امیر جامعہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں[۱۸] کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے جامعہ کو مرحوم کی بڑھاپے کی اولاد سے تعبیر کیا اور اس کا بانی قرار دیا جو انھیں اپنے بیٹے حکیم جمیل خان اور طبیہ کالج سے کسی طرح کم عزیز نہ تھی۔ اور تحریر کیا:

”ہمارے امراض کا علاج اسلام اور صرف اسلام ہے، اور اسی بنیاد پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعمیر ہوئی ہے۔“

مولانا نے انکشاف کیا کہ حکیم صاحب کا ارادہ تھا کہ کسی طرح ایک عرب کی خدمات حاصل کر کے جامعہ کے طلبہ کو روزمرہ عربی میں گفتگو کرنے کی مشق کرائیں اور انھیں اس زبان سے واقف کرایا جائے جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔ اس طرح وہ عربی میں تحریر و تقریر کی اس قدر مہارت پیدا کر لیں جس قدر کہ انگریزی مدارس کے طلبہ انگریزی سے واقف ہوتے ہیں۔

”اسی لیے نصاب جامعہ میں سب سے خاص بات جو رکھی گئی وہ یہ کہ عربی لازمی ہو اور نثر کا تمام تر کورس قرآن کریم ہو، تا کہ طالب علم اس قدر عربی سیکھ لے کہ قرآن کریم اور حدیث نبوی کو کم از کم اس طرح سمجھ سکے جس طرح ایک اُمی عرب رسول کریم کے زمانے میں سمجھ سکتا تھا تا کہ اسے اپنی مذہبی ضروریات کے لیے کسی دوسرے کا دست نگر نہ ہونا پڑے۔ اس طرح

جامعہ مسلمان طلبہ کو ان کے دین سے آگاہ کرتی ہے تا کہ وہ دنیا کو صحیح طور سے برت سکیں۔‘‘[۱۹]

جامعہ کے نصاب میں سب سے نمایاں خصوصیت عربی زبان کو لازمی قرار دینا تھی۔عربی محض زبان سکھانے کے لیے نہیں بلکہ اس غرض سے شامل کی گئی کہ طلبہ قرآن کریم اور احادیث نبویہ کو براہ راست سمجھ سکیں۔مقصود یہ تھا کہ مسلمان طالب علم دینی معاملات میں کسی دوسرے کے محتاج نہ رہیں بلکہ دین کے اصل مآخذ سے براہ راست علم حاصل کرنے کے اہل بن سکیں۔یہ ایک فکری خود مختاری (intellectual independence) کی تعلیم تھی۔

مادری زبان ذریعہ تعلیم

جامعہ پر اپنے تیسرے مضمون بعنوان ’’جامعہ ملیہ اسلامیہ کی چند اور خصوصیات‘‘ میں مادری زبان میں تعلیم کے تعلق سے جو ہمدرد کے ۹؍جنوری ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا مولانا نے تحریر کیا:

> ’’جامعہ ملیہ کی سب سے بڑی اور سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہاں مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔جامعہ کے بانی کو تجربہ ہو چکا تھا اور اسی لیے اس نے جامعہ میں تحصیل علوم کے لیے صرف مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جامعہ میں کم از کم دو سال صرف ہوتے ہیں اور اس کے طالب علموں کی معلومات دوسری درگاہوں کے طلبہ سے اس قلیل عرصہ میں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔‘‘[۲۰]

جامعہ میں مادری زبان یعنی اردو ذریعہ تعلیم ہے۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے مزید کہا تھا کہ یوں تو اردو کے نام نہاد حامی کروڑوں ہیں لیکن اس کے حقیقی حامی نظام الملک آصف جاہ تھے جنھوں نے جامعہ عثمانیہ میں اردو ہی کو تحصیل علوم کا ذریعہ بنایا اور دار الترجمہ قائم کر کے اردو کو اس قابل بنایا کہ وہ تحصیل علوم کا ذریعہ بن سکے یا جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اس کی اکادمی کے کار پرداز ہیں جو باوجود اپنی بے بضاعتی کے نظام الملک آصف جاہ کی تقلید کر رہے ہیں۔آج بھی اس کی اکادمی کے پاس دس کتابیں ایسی موجود ہیں جن کو وہ طبع اور شائع کر سکتی ہے اور اپنے مکتبے کے ذریعہ سارے ملک میں

پھیلا سکتی ہے مگر افسوس کہ اس کا سہ دینار کیا درہم تک سے خالی ہے ورنہ یہ کتابیں آج اردو دانوں کے ہاتھوں میں ہوتیں۔ مولانا نے مزید تحریر کیا کہ مذہب کا نام لینے والے کروڑوں ہیں لیکن جامعہ مذہب کا نام ہی نہیں لیتی اس کی صحیح معنوں میں خدمت بھی کر رہی ہے۔ اردو کے حامی بھی کروڑوں ہیں لیکن جامعہ عثمانیہ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ ہی اردو کی سچی حمایت کر رہی ہیں۔

پیشہ ورانہ تربیت

مولانا کا چوتھا مضمون ''ہمدرد'' کے ۱۶رجنوری ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا'' جامعہ ملیہ اسلامیہ: مسلمانوں کی اقتصادی حالت کی اصلاح'' اس مضمون میں مولانا محمد علی جوہر نے دینی اور دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ جامعہ کا مقصد یہ بھی بتایا کہ طلبائے جامعہ کو اکلِ حلال اور باعزت طریقوں سے حصول رزق کے لیے کوئی دستکاری ایسی سکھائی جائے جس سے وہ اپنی روزی خود پیدا کر سکیں۔

> '' جامعہ ہی سمجھتی ہے کہ اس درجہ کی اصلاح کسی طرح کی جائے۔ مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی کی اصلاح کے صرف دو طریقے تھے؛ ایک یہ کہ ان کی ضروریات زندگی کو یوروپ والوں کی طرح بڑھانے کے بجائے گھٹایا جائے اور دوسرا یہ کہ اور جو کچھ بھی ان کو سکھایا جائے لیکن اتنا تو ضرور سکھا دیا جائے کہ دستکاری میں کوئی عیب نہیں ہے، اس کے ذریعے سے بھی کسب معاش ممکن ہے۔ چنانچہ جامعہ نے اپنے طلبہ کے اخراجات کی جو اسکیم مقرر کی ہے۔ وہ اس اصول کے مطابق مقرر کی ہے اس کے علاوہ جامعہ میں تاریخ وفلسفہ، ادب اور سائنس پر مضمون کے پڑھنے والے کے لیے یہ بھی لازمی کر دیا گیا ہے کہ ہفتہ میں چند گھنٹے کسی نہ کسی دستکاری کی نذر کیے جائیں، اس لیے کہ اگر ایم اے کے طلبہ کو بھی ضرورت پڑے تو اکل حلال کو چھوڑ کر حرام خوری پر مجبور نہ ہو جائیں۔ جامعہ نے اسی اصول پر عامل ہو کر اپنے طلبہ کے دست و دماغ دونوں کو برسرکار لگا دیا ہے تا کہ فقط ایک ہی

سے کسب معاش کا کام نہ لیا جائے بلکہ دونوں سے حسب ضرورت یہ کام لیا
جا سکے۔''[۲۱]

جامعہ میں بچوں کی دکان اور بنک کے ذریعہ تجارت کے میدان میں عملی تربیت کے سلسلہ میں مولانا نے تحریر کیا کہ اگر چہ جامعہ کو بنکوں میں سرمایہ جمع کرا کے سود کھانا نہیں سکھایا جاتا تاہم انھیں اپنی دکان لگانا سکھایا جاتا ہے تا کہ وہ اپنی ضروریات کی چیزیں خود فروخت کر سکیں۔ مولانا نے بتایا کہ جلد ہی ان کا ایک بنک بھی کھلوا دیا جائے گا جس میں ان کا جیب خرچ جمع ہو سکے اور حسبِ ضرورت نکالا جا سکے اور ان کا باقاعدہ حساب کتاب رکھا جا سکے۔ انھیں کپڑے دھونے، کھانا بنانے کپڑے سینے اور نان بائی کا کام سیکھنے کی مشق کرائی جائے گی۔ انھوں نے طلبہ کے ناشتہ، کھانا، لباس، رہائش، تعلیم، ورزش صحت وغیرہ پر ہونے والے اخراجات کا تخمینہ دے کر ان کے لیے دستکاری کو از بس ضروری قرار دیا جو جامعہ کی خصوصیات میں شامل تھی۔

عملی زندگی سے ربط

جامعہ کی تعلیم محض مذہبی یا نظریاتی نہیں بلکہ عملی زندگی کے تقاضوں سے مربوط تھی۔ اس نے اس تصور کو توڑا کہ تعلیم یافتہ مسلمان صرف مسجد کے ملا یا دفتر کے کلرک بن سکتے ہیں۔ جامعہ نے یہ مقصد طے کیا کہ اس کے طلبہ زندگی کے ہر شعبے میں حصہ لے سکیں، خواہ وہ سیاست، ادب، سائنس تعلیم یا سماجی خدمت ہو۔ یوں جامعہ نے تعلیم کو زندگی کی جامع تیاری کا ذریعہ بنایا۔

> ''اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مسلمان یا تو مسجد
> کے ملا ہوتے تھے یا سرکاری دفتر کے کلرک، جامعہ ملیہ کی تعلیم کا مقصد یہ ہے
> کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے تلامذہ حصہ لے سکیں اور دنیا کا کوئی
> دروازہ ان پر بند نہ ہو۔''[۲۲]

خلاصہ یہ کہ جامعہ ملیہ کا تعلیمی فلسفہ علم، ایمان، عمل اور خدمت خلق کے ہمہ گیر امتزاج پر مبنی تھا۔ یعنی جامعہ ایک ایسا ماڈل پیش کرتا ہے جس میں تعلیم محض معلومات کی ترسیل نہیں بلکہ شخصیت کی تعمیر، اخلاقی تربیت، قومی شعور اور روحانی بصیرت کا مکمل نظام ہے۔

جامعہ کے علی گڑھ سے دہلی منتقل ہونے کے بعد اس کے نصب العین میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ اس تبدیلی کو سمجھنے کے لیے ڈاکٹر سید عابد حسین [۲۳] کے دو مضامین غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ پہلا طویل مضمون انھوں نے دسمبر ۱۹۲۷ء میں ''مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ اس میں چند صفحات اپنے محترم دوست شیخ الجامعہ ذاکر حسین کی خدمت میں اس امید کے ساتھ پیش کیے کہ وہ اس عظیم کام یعنی جامعہ کے لیے ایک جامع تعلیمی نصب العین کی تشکیل میں رہنمائی اور معاونت فراہم کریں گے۔ یہ وہی منصوبہ تھا جسے ذاکر حسین، محمد مجیب اور عابد حسین نے مشترکہ طور پر اپنے ذمہ لیا تھا۔ دوسرا مختصر مضمون دسمبر ۱۹۶۳ء میں ''جامعہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۶ء تک'' کے عنوان سے پیش کیا گیا، جس میں انھوں نے جامعہ کے مقام کی تبدیلی کے نتیجے میں اس کے نصب العین میں آنے والی فکری و تعلیمی تبدیلیوں پر تفصیلی گفتگو کی۔ ان دونوں مضامین کے تجزیے کی روشنی میں ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ۱۹۲۵ء کے بعد جامعہ ملیہ کیا ہے اور اس کی حیثیت اور تصور تعلیم کس سمت میں آگے بڑھی۔ اس ضمن میں عابد صاحب کہتے ہیں:

> ''یہ محض مقام کی تبدیلی نہیں بلکہ بڑی حد تک نصب العین کی تبدیلی یا یوں کہیے کہ نصب العین کا تعین تھا۔ جب تک جامعہ علی گڑھ میں رہی دو مقاصد کے بیچ میں جھولتی رہی۔ ایک یہ کہ وہ ایک مستقل تعلیم گاہ اور مسلمانوں کی تعلیم اور زندگی کا ایک ایسا نقشہ بنائے جس میں دینی اور دنیوی اقدار کے پرانے اور نئے زمانے کے رنگ سموئے ہوں۔ اس خیال کے نمائندے حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری اور خواجہ عبدالمجید تھے۔ دوسرا یہ کہ جامعہ ایک عارضی کیمپ ہو جہاں جنگِ آزادی کے سپاہی قومی تحریک میں حصہ لے کر ہندوستان کو آزاد کرا سکیں اور پھر فاتح کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی پر جہاں سے وہ نکالے گئے تھے، قبضہ کریں اور اس کی اصلاح کریں۔ یہ نقطہ نظر مولانا محمد علی کا تھا جن کا یہ قول سننے میں آیا ہے: ''ہمارا کعبہ علی گڑھ کالج'' ہے۔ جامعہ کی زندگی تو ہجرت کی زندگی ہے۔ آخر میں ہمیں مکے کو فتح کرنا ہے۔'' [۲۴]

عابد صاحب مزید لکھتے ہیں:

''جن دنوں نان کوآپریشن(Non-Cooperation) اور خلافت کی تحریکوں کا زور تھا عام طور پر لوگوں کو ایسا لگتا تھا کہ بس اب ملک آزاد ہونے والا ہے اور جامعہ کے مہاجرین کعبہ مقصود پر قبضہ کرنے والے ہیں۔ اس لیے جامعہ کے بارے میں مسلمانوں کی عام رائے مولانا محمد علی کے ساتھ تھی مگر ۱۹۲۵ء میں واقعات کا رخ بدل چکا تھا۔ نان کوآپریشن کی تحریک تھک کر شل ہوگئی تھی اور خلافت کی تحریک دم توڑ رہی تھی۔ جب ان حالات میں مولانا محمد علی اور ان کے ہم خیالوں نے جامعہ سے ہاتھ کھینچ لیا اور چند منچلے طالب علموں کی درخواست پر حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری نے جامعہ کو دہلی منتقل کر کے اس کو چلانے کا ذمہ لیا تو گویا یہ فیصلہ ہوگیا کہ جامعہ ایک مستقل تعلیم گاہ ہے۔ اس کا اصل مقصد تعلیم ہے۔ سیاسی مقصد محض ضمنی ہے اور وہ بھی عملی سیاست میں حصہ لینا نہیں بلکہ صرف اپنے طالب علموں میں آزادی کا جذبہ اور قومیت کی روح پیدا کرنا ہے۔''[۲۵]

دہلی آنے پر جامعہ کی ذہنی فضا کی تبدیلی کا اندازہ آپ کو اس سے ہوگا کہ دو سال بعد جب گاندھی جی جامعہ میں تشریف لائے تو اسکول کے بچوں نے خیر مقدم کے ایڈریس میں کہا:

''آپ خوب جانتے ہیں کہ ہماری جامعہ نے ایک بہت بڑے کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ ہم کو ایسی تعلیم دینا چاہتی ہے جس سے ہم خدا کے نیک بندے، اپنے دیس کے سچے خادم اور سب انسانوں کے بھلائی چاہنے والے بن جائیں، وہ ہمیں یہ سکھانا چاہتی ہے کہ ہم اپنے علم و ہنر سے اپنے اخلاق کو سنواریں، محنت اور مشقت سے اپنے اور اپنے عزیزوں کے لیے حلال کی روزی کمائیں اور خلوص اور ہمدردی سے اپنی قوم کی ترقی اور اپنے ملک کی آزادی کے لیے کوشش کریں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ آج کل زمانے کی ہوا ہمارے خلاف ہے۔ ملک میں لڑائی اور فساد کی آندھیاں چل

رہی ہیں، جن سے پیار اور محبت کی کھیتی مرجھائی جاتی ہے۔ ہم آپ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ یہ پودے جنھیں آپ نے اور دوسرے بزرگوں نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا، اگر سوکھ بھی جائے تو ان کے بیج برباد نہیں ہو سکتے۔ وہ ہمارے دلوں میں محفوظ ہیں اور اگر خدا نے چاہا تو ان سے پھر نئے پودے نکلیں گے اور زہریلی بلاؤں سے بچ کر مضبوط اور تناور درخت بن جائیں گے۔''[۲۶]

گاندھی جی نے جو جواب دیا تھا اس کا بھی ایک ٹکڑا سن لیجئے:

''اس زمانے میں جب ہندو مسلمان ایک ہو گئے تھے، ایک دوسرے کے لیے اور اپنے وطن کی خاطر اپنا خون بہانے کو تیار تھے۔ میں نے طلبہ کو سرکاری اسکول اور کالج چھوڑنے کی دعوت دی تھی۔ میں اس قابلِ فخر زمانے کے کچھ آثار یہاں دیکھ کر بہت خوش ہوا، مجھے نہایت مسرت ہے کہ آپ آزادی اور اتحاد کے اس جھنڈے کو بلند رکھنے کے لیے پوری جاں فشانی سے کام لے رہے ہیں۔ اگرچہ آپ کی تعداد کم ہے لیکن دنیا میں اچھے اور سچے آدمی بہت کم ہوئے ہیں۔ میں آپ کو یہی نصیحت کروں گا کہ اس قلت تعداد کا کچھ خیال نہ کیجئے بلکہ اس بات کو پیش نظر رکھیۓ کہ ملک کی آزادی کا انحصار آپ کے اوپر ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے جن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے وہ ہیں خدا کا خوف اور انسانوں سے اور ان کے اس مجموعے سے جسے حکومت یا سلطنت کہتے ہیں، بے خوف ہونا، ان دو چیزوں کی تعلیم اگر آپ کی اس درسگاہ میں نہیں ہوسکتی ہے تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ کہاں ہوسکتی ہے۔ میں آپ کے پروفیسروں کو خوب جانتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ان چیزوں کی تعلیم ضرور ہوتی ہے۔''[۲۷]

قوموں کی زندگی اس رشتے پر قائم ہے جو انھیں خالق کائنات اور نظام کائنات سے جوڑتا

ہے، اور یہی رشتہ مذہب کہلاتا ہے۔ جب تک قوم اس رشتے کو مضبوطی سے تھامے رکھتی ہے، اس میں زندگی، حرکت اور ترقی کی روح باقی رہتی ہے، لیکن جب یہ تعلق کمزور ہو جاتا ہے تو قوم زوال، یاس اور خودغرضی کا شکار ہو جاتی ہے۔ عابد صاحب نے اپنے مضمون 'مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ' میں مسلمانوں کی مثال دیتے ہوئے بتایا ہے کہ زوال کے ایک طویل دور کے بعد ان کا تصادم یورپ کی ترقی یافتہ تہذیب سے ہوا، جس کے نتیجے میں ان میں مذہبی بیداری اور زندگی کی آرزو دوبارہ جاگ اٹھی۔ یہی بیداری ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی پیدا ہوئی، جس نے انھیں اپنی کھوئی ہوئی شناخت دوبارہ حاصل کرنے کی تحریک دی۔ تاہم محض مذہبی بیداری کافی نہیں، بلکہ اس کی بنیاد پر ایک مکمل تمدن کی تعمیر ضروری ہے، جو علم وتعلیم، معیشت، سیاست اور اخلاق کے تمام پہلوؤں پر محیط ہو۔ اس مقصد کے لیے علم وتعلیم کو پہلا زینہ قرار دیا گیا ہے، کیونکہ یہی تمدن کی بقا اور ترقی کی ضامن ہے۔ عابد صاحب کے نزدیک مسلمانوں کو اپنی تعلیمی اصلاح کی ابتدا اپنے اسلاف کے علمی ورثے سے کرنی چاہیے، لیکن یورپ اور دیگر اقوام سے بھی علمی استفادہ ضروری ہے۔ ساتھ ہی ہندی مسلمانوں کو اپنے ہندو برادران وطن کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت کی بنیاد رکھنی ہے۔ جامعہ ملیہ کے قیام کو اسی مقصد کا مظہر بتاتے ہوئے وہ کہتے ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل کو ایسی تعلیم دی جائے جو انھیں ایک مکمل انسان سچا مسلمان اور پکا ہندوستانی بنائے، تاکہ وہ مادر ہند کے وفادار سپوت اور عالمی تمدن کے مفید رکن ثابت ہوں۔ [۲۸]

عابد صاحب اس مضمون کے تیسرے حصہ میں علمی تحقیق (Research) کی اہمیت، اس کے اصول، مقاصد وطریقۂ کار پر ایک جامع فکری خاکہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک علمی تحقیق انسانی ذہن کی ایک فطری ضرورت ہے، جو علم جستجو اور تہذیب نفس کی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہے۔ علم ایک متحرک قوت ہے جو وقت کے ساتھ وسعت اور اصلاح کے مراحل سے گزرتی رہتی ہے۔ اسی طلب حق اور تجدید علم کا نام ''تحقیقات علمی'' ہے۔ تحقیق کا بنیادی مقصد ذہن انسانی کی تربیت اور اس کی علمی واخلاقی قوتوں کا ارتقا ہے۔ یہ انسان میں ضبطِ نفس، صداقت پسندی، جفاکشی اور نظم وضبط جیسی اعلیٰ صفات پیدا کرتی ہیں۔ اگرچہ علمی تحقیق کے نتیجے میں معاشی یا فنی فوائد حاصل ہوتے ہیں مگر یہ سب ثانوی ہیں؛ اصل مقصد حق کی تلاش اور فکری بلندی ہے۔ محقق کو بیرونی دباؤ اور مذہبی یا سیاسی مفادات سے آزاد ہو کر جرات مندی سے سچائی کی جستجو کرنی چاہیے۔ عابد صاحب کے مطابق تحقیق کو زندگی اور تہذیب سے کاٹ کر نہیں

بلکہ ان کے ساتھ ہم آہنگ کر کے انجام دینا چاہیے۔ تحقیق کے دو پہلو: ''تجزیہ'' (Analysis) او''ر ترکیب" (Synthesis) لازم وملزوم ہیں اور جامعہ وہ مقام ہے جہاں یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اسی لیے تعلیم اور تحقیق ایک ہی عمل کے دو پہلو ہیں۔ عابد صاحب تجویز دیتے ہیں کہ جامعہ ملیہ میں علمی تحقیق کے لیے اردو اکادمی قائم کی جائے جو اساتذہ اور فارغ التحصیل طلبہ پر مشتمل ہو۔ اس کا مقصد اسلامی تہذیب کی علمی تاریخ اور اردو زبان میں علمی سرمایہ اور بین الاقوامی علمی ربط پیدا کرنا ہوتا کہ مسلمان طلبہ تحقیق وعلم کے میدان میں عالمی سطح پر مؤثر کردار ادا کر سکیں۔ [۲۹]

عابد صاحب اپنے مضمون کے چوتھے حصہ میں جامعہ ملیہ کے تیسرے مقصد ''اشاعت علوم'' کی وضاحت کرتے ہیں۔ عابد صاحب کے مطابق علمی تحقیقات کے نتائج سے براہ راست فائدہ محققین اور ماہرین ہی اٹھا سکتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ان نتائج کو عام فہم انداز میں عوام تک پہنچایا جائے تا کہ قوم کا عمومی علمی معیار بلند ہو۔ اشاعت علوم کا مقصد علمی نتائج کو سادہ، دلچسپ اور قابل فہم پیرائے میں پیش کرنا ہے، مگر اس کوشش میں حقیقت اور علمی دیانت سے انحراف نہیں ہونا چاہیے۔ مصنف وضاحت کرتا ہے کہ اشاعت علوم اور سیاسی یا مذہبی تبلیغ کے طریقوں میں بنیادی فرق ہے۔ مذہب دل و وجدان سے اور سیاست جذبات سے تعلق رکھتی ہے، جب کہ علم عقل اور منطق کا تابع ہے۔ اس لیے علم کی اشاعت کا طریقہ دلائل و براہین پر مبنی ہونا چاہیے نہ کہ جذباتی یا خطیبانہ انداز میں۔ تاہم اشاعت علوم مذہب و سیاست سے بالکل الگ بھی نہیں، کیونکہ ان کے مباحث بھی علم کے دائرے میں شامل ہیں۔ عابد صاحب کا خیال ہے کہ اس مقصد کے لیے جامعہ ملیہ کی اردو اکادمی کو فعال کردار ادا کرنا چاہیے، جو نہ صرف نصاب تعلیم کی تیاری کرے بلکہ ادب، فنونِ لطیفہ تاریخ، سائنس اور فلسفے جیسے مختلف میدانوں میں معیاری اور عام فہم کتابیں شائع کرے۔ اس اشاعت کا آغاز ادب اور فنون لطیفہ سے ہونا چاہیے کیونکہ یہ انسانی ذہن میں ذوق حسن پیدا کرتے ہیں اور فکری ارتقا کی پہلی منزل ہیں۔ اشاعت علوم ایک نہایت مشکل مگر ضروری فریضہ ہے، جس کے لیے علمی بصیرت زبان پر قدرت اور اخلاقی دیانت رکھنے والے اہل علم کی ضرورت ہے۔ [۳۰]

عابد صاحب اپنے مضمون کے آخری حصہ میں جامعہ ملیہ کے چوتھے مقصد ''قوم کے نوجوانوں کو کسب معاش کے لیے تیار کرنے'' پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان کے مطابق تعلیم کا مقصد صرف ذہنی تربیت

نہیں بلکہ ایسا نظام تربیت ہونا چاہیے جو انسان کو معاشی اخلاقی اور روحانی لحاظ سے متوازن شخصیت بنائے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا مقصد بچوں کی ذہنی واخلاقی قوتوں کو بیدار کرنا ہے، اس مرحلے میں پیشے کی تعلیم کو مرکزی حیثیت دینا مناسب نہیں ورنہ بچہ صرف کمانے کی مشین بن جائے گا۔ البتہ بچوں میں محنت، صفائی اور کفایت شعاری جیسی عادات پیدا کرنی چاہئیں تاکہ وہ مستقبل میں کسی بھی پیشے کے اہل ہوسکیں۔ اعلیٰ تعلیم کی سطح پر طالب علم ذہنی واخلاقی پختگی حاصل کرلیتا ہے، لہٰذا یہاں اسے زندگی کے کسی نصب العین کے ساتھ عملی پیشے کی تیاری کا موقع ملنا چاہیے۔ جامعہ کا کام خالص علمی تربیت ہے، لیکن اسے ایسے علوم وفنون کی تعلیم بھی دینی چاہیے جو تمدنی زندگی میں عملی اہمیت رکھتے ہوں۔ البتہ طب، انجینئری یا دستکاری جیسے پیشوں کی تعلیم کے لیے علیحدہ اداروں کا قیام ضروری ہے۔ مصنف زور دیتا ہے کہ پیشے کا انتخاب صرف مالی فائدے یا ظاہری عزت کی بنیاد پر نہیں بلکہ مزاج، قابلیت اور قومی خدمت کے جذبے سے ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ سرکاری ملازمت کو ہی عزت کا معیار سمجھتے ہیں، جس سے ذہنی سکون اور اجتماعی ترقی دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ عابد صاحب مضمون کے آخر میں تجویز کرتے ہے کہ جامعہ ملیہ مختلف قسم کی پیشہ آموز تعلیم گاہیں قائم کرے تاکہ نوجوان کسب معاش کے نئے راستے تلاش کریں، خودمختار بنیں اور معاشرے کے لیے عملی نمونہ پیش کریں۔ یہ اقدام جامعہ کے فکری و تمدنی نصب العین کی تکمیل کا بہترین ذریعہ ہوگا۔ [۳۱]

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں ذاکر صاحب [۳۲] کو UNESCO کی کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جانا پڑا۔ اس موقع پر جامعہ کے آئندہ منصوبوں کو کتابچوں کی صورت میں ''ہمدردانِ جامعہ'' تک پہنچایا گیا۔ انہی میں ایک اہم کتابچہ ''جامعہ ملیہ کیا ہے؟'' کے عنوان سے تھا، جسے خود ذاکر صاحب نے تحریر کیا۔ اس کتابچے کی روشنی میں ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ ذاکر صاحب کی نظر میں جامعہ ملیہ دراصل کیا ہے۔

۱۔ جامعہ، اصلاح تعلیم، آزادیٔ فکر اور خودانحصاری کی علامت

جامعہ ایک ایسے تعلیمی تجربے کی مثال ہے جو برصغیر میں روایتی اور جامد تعلیمی نظام کے خلاف ایک انقلابی قدم کے طور پر اُبھری۔ ذاکر صاحب نے جامعہ کو اُن ''سرپھرے لوگوں'' کی کوششوں میں شمار کیا ہے جنھوں نے ہندوستان میں تعلیم کے مروجہ طریقوں سے ہٹ کر ایک نیا آزاد قومی وعملی بنیادوں

پر استوار نظام تعلیم قائم کرنے کی جرأت کی۔ وہ لکھتے ہے:

''یورپ اور امریکہ میں جہاں تعلیم کا ایک بندھا ٹکا نظام موجود ہے، وہاں یہ بھی ہے کہ بعض لوگ نئے نئے تعلیمی تجربے کرتے ہیں۔ پرانے نظام کی خرابیوں اور کمزوریوں کی چھان بین کرتے ہیں اور ان کے سدھارنے کی تدبیریں سوچتے ہیں۔ سوسائٹی اور اس کی نائب یعنی حکومت اُن لوگوں کی مدد کرتی ہے، اور ان کی بتائی ہوئی تجاویز پر غور کرتی ہے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ پرانی تعلیم کے سر براہ ان تجاویز کو جلد قبول کر لیتے ہیں۔ انسان کا قاعدہ ہے کہ اپنی غلطی کو بڑی مشکل سے مانتا ہے اور ایک ڈگر کو چھوڑ کر دوسری راہ پر بڑی دیر میں چلتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں بھی پہلے تو لوگ نئے مدرسوں پر ہنستے ہیں مگر جب عام رائے انھیں پسند کرنے لگتی ہے تو پھر پرانے مدرسوں کو بھی آہستہ آہستہ اپنا طریقہ بدلنا پڑتا ہے۔ اب رہا ہمارا ہندوستان سو یہ تو یورپ سے کہیں بڑھ کر لکیر کا فقیر ہے۔ یہاں تو ہر نئی چیز کفر اور بغاوت سمجھی جاتی ہے۔ اب سے سوا سو سال پہلے جب انگریزی تعلیم رائج کی گئی تو ایک مدت تک اس کی مخالفت ہوتی رہی مگر اب وہی تعلیم دھرم بن گئی ہے اور اس سے ایک قدم ہٹنا بھی مہا پاپ ہو گیا ہے۔ اس لیے یہاں لوگوں کی ہمت نہیں پڑتی کہ نئے تعلیمی تجربے کریں۔ پھر بھی تھوڑے دنوں سے کچھ سر پھرے لوگوں نے اس قسم کے تجربے شروع کیے ہیں جن میں سے ایک جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی ہے۔''[۳۳]

اس اقتباس کے تناظر میں ذاکر صاحب نے جامعہ کو ایک نئی تعلیمی تحریک اور تجربہ کے طور پر پیش کیا ہے جو اصلاحِ تعلیم، آزادیٔ فکر و خود انحصاری کی علامت ہے۔

۲۔ جامعہ محض ایک درسگاہ نہیں بلکہ غلامانہ نظام تعلیم کے خلاف ایک قومی و فکری بغاوت

جامعہ ایک نیا تعلیمی تجربہ اور قومی تعلیمی تحریک تھی، جسے ان رہنماؤں نے قائم کیا جو انگریزی تعلیم کے نظام سے مایوس ہو چکے تھے۔ ان کے نزدیک سرکاری تعلیم صرف نوکری کے لیے تھی، نہ کہ قومی

یا تہذیبی تربیت کے لیے۔ لہٰذا جامعہ کا مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا تعلیمی نظام قائم کیا جائے جو ملکی اور قومی ضرورتوں کے مطابق ہو، انسانی اور اخلاقی صفات کو پروان چڑھائے، آزادی، خود اعتمادی اور خدمت خلق کا جذبہ پیدا کرے اور اپنی زبان اور اپنی تہذیب کی بنیاد پر طلبہ کی تعلیم و تربیت کرے۔ ذاکر صاحب لکھتے ہے:

> ''یہ مشہور اور سچی بات ہے کہ موجودہ انگریزی تعلیم حکومت نے اپنی انتظامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شروع کی تھی۔ اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ دفتروں میں کام کرنے کے لیے انگریزی پڑھے لکھے لوگ مل جائیں۔ آگے چل کر اس تعلیم کا معیار بڑھ گیا اور ہر قسم کے مفید علوم پڑھائے جانے لگے مگر کبھی اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ ملکی اور قومی ضرورتوں کا لحاظ رکھ کر تعلیم کا ایسا نصاب بنایا جائے جو ہماری زندگی اور ہماری تہذیب کے لیے مناسب ہو۔ قومی تعلیم کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں انسانی تہذیب کی بہترین صفات اپنے خاص قومی رنگ میں پیدا کرے اور دوسرا کام یہ ہے کہ انھیں سوسائٹی کی خدمت کے لیے ہر قسم کے مفید پیشے سکھائے اور روزی کمانے کے قابل بنائے۔ پہلے کام کی طرف تو کبھی توجہ کی ہی نہیں گئی اور دوسرے کی طرف بھی بس اتنی کہ طالب علم نوکری کے لیے تیار کیے جائیں۔ غرض ہماری تعلیم تہذیبی تعلیم نہیں بلکہ صرف پیشے کی تعلیم ہے اور وہ بھی صرف ایک پیشے یعنی نوکری کی، اس لیے ظاہر ہے کہ ادھوری اور چھچھوری تعلیم ہے۔ تعلیم اور تربیت کے طریقے کو دیکھیے تو وہ بھی پرانا نکما طریقہ ہے جس میں استاد شاگردوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا نہیں سکھاتا، بلکہ انگلی پکڑ کر چلاتا ہے۔ تعلیم اس طرح ہوتی ہے کہ استاد کتاب کا سبق پڑھوا کر خود عبارت کا مطلب سمجھا دیتا ہے اور تربیت اس طرح کہ سزا یا تنبیہ کے ڈر سے بچہ شرارت سے باز رکھا جاتا ہے۔ یعنی اسے یقین دلایا جاتا ہے کہ استاد اس سے زیادہ شریر اور طاقت ور ہے اور

شرارت کرنے کا حق صرف اس کو ہے جو طاقت ور ہو۔ تعلیم کا سارا بوجھ حافظے پر پڑتا ہے جس سے ذہن میں سوچنے کی قوت نہیں پیدا ہوتی اور تربیت کا دارومدار خوف پر ہے جس سے بچے ڈرپوک بن جاتے ہیں اور سزا سے بچنے کے لیے جھوٹ بولنا سیکھتے ہیں۔ آزادی اور ذمہ داری کا احساس ان میں پیدا نہیں ہونے پاتا۔ سب سے بڑی خرابی موجودہ تعلیم کی یہ ہے کہ تعلیم کا ذریعہ اپنی زبان نہیں بلکہ غیر زبان ہے۔ اس ذہنی غلامی کی مثال انسانوں کی دنیا میں صرف ہندوستان میں اور حیوانوں کی دنیا میں صرف طوطے میں نظر آتی ہے۔ اس تعلیم نے سو سال میں ملک کی جو حالت کر دی ہے اُس سے ممکن ہے کہ کچھ لوگ مطمئن ہوں مگر ملک کے چند بڑے رہنما اس قدر مایوس ہوئے کہ انھوں نے ایک نیا تجربہ مسلمانوں کو قومی تعلیم دینے کا شروع کیا اور ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔''[۳۴]

یعنی ذاکر صاحب کے نزدیک جامعہ محض ایک درسگاہ نہیں بلکہ غلامانہ نظامِ تعلیم کے خلاف ایک قومی و فکری بغاوت اور آزاد، خوددار اور قومی تعلیم کا عملی مظہر ہے۔

۳۔ جامعہ، اسلام، قومیت، انسانیت اور آزادی کے حسین امتزاج کا مظہر

جامعہ ایک ایسی قومی و دینی تعلیمی تحریک ہے جس کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کے لیے زندگی کا ایسا جامع نقشہ تیار کرنا ہے جو اسلامی تعلیمات پر مبنی ہو، مگر ساتھ ہی ہندوستانی قومی تہذیب اور انسانی یکجہتی کے رنگ میں رچا بسا ہو۔ جامعہ کا ایمان ہے کہ اسلام کی سچی تعلیم انسان کو وطن سے محبت، قومی اتحاد، آزادی و عالمی امن کی خدمت کے لیے تیار کرتی ہے۔ ذاکر صاحب لکھتے ہے:

''جامعہ ملیہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کی سچی

تعلیم ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی اور ہندوستان کی آزادی اور ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی اور آزاد ہندوستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن و تہذیب کی مفید خدمت کرے گی۔ تنگ نظری اور تعصب کے اس دور میں یہ تصور محض خواب وخیال معلوم ہوتا ہے مگر دنیا کی تاریخ میں بہت سے شیخ چلی ایسے ہی خواب دیکھتے آئے ہیں اور ہمت وخلوص، محنت اور استقلال کی برکت سے ان کے خواب حقیقت کا جامہ پہنتے رہے ہیں۔ اگر ہم میں یہ صفات تھوڑی بہت بھی موجود ہیں تو ہمارا یہ خواب بھی سچا ہو کر رہے گا۔ مجھے اعتراف ہے کہ جامعہ کے کارکنوں کے ذہن میں یہ نقشہ ابھی دھندلا ہے اور اسے واضح اور متعین کرنے کے لیے وہ دوسروں کے مشورے اور اپنے مشاہدے اور تجربے سے مدد لے رہے ہیں۔ راہ طلب میں بھٹکنا، ٹھوکریں کھانا اور سنبھلنا غلطی کرنا اور سیکھنا یہی انسانی ترقی کا راز ہے۔''[۳۵]

لہٰذا، اس پس منظر میں ذاکر صاحب کا ماننا ہے کہ جامعہ صرف ایک تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ اسلام قومیت، انسانیت اور آزادی کے حسین امتزاج کا بہترین مظہر ہے۔

۴۔ جامعہ، تعلیم کو زندگی، خدمت اور تہذیبی شعور سے جوڑنے والا ایک جامع تعلیمی ماڈل

جامعہ ایک ایسا تعلیمی وتربیتی ادارہ ہے جو محض روزی یا علم برائے علم کے نظریے کو رد کرتے ہوئے علم برائے زندگی کے اصول پر قائم ہے۔ جامعہ کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو ایسی ہمہ گیر تعلیم دی جائے جو مذہب، حکمت، صنعت سیاست ومعیشت سب کو زندگی کے ایک متوازن نظام میں شامل کرے۔ یہ اپنے طلبہ میں یہ شعور پیدا کرنا چاہتی ہے کہ علم کا اصل مقصد قوم وانسانیت کی خدمت ہے اور روزی کمانا خدمت خلق اور اجتماعی فلاح کا تابع ہونا چاہیے۔ ذاکر صاحب لکھتے ہے:

''جامعہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کے اس نقشے کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم کا ایک مکمل نصاب بنایا جائے اور اس کے مطابق ان کے بچوں کو جو مستقبل کے مالک ہیں تعلیم دی جائے۔ علم

محض روزی کے خاطر جو ہمارے ملک کی جدید تعلیم کا اصول ہے، اور علم محض علم کی خاطر جو قدیم تعلیم کا اصول تھا، دونوں کو جامعہ بہت تنگ اور محدود سمجھتی ہے۔ وہ علم کو زندگی کی خاطر سکھانا چاہتی ہے جس کے وسیع دائرے میں مذہب، حکمت اور صنعت، سیاست اور معیشت سبھی کچھ آجاتا ہے۔ وہ اپنے طلبہ کو اس قابل بنانا چاہتی ہے کہ قومی تہذیب اور عام انسانی تہذیب کی ہر شاخ کی قدر و قیمت کو سمجھ سکیں اور اپنی قابلیت کے مطابق اس کی کسی ایک شاخ میں اس طرح سے کام کریں کہ ان کا کام کسی نہ کسی حد تک مجموعی زندگی کے لیے مفید ہو۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہندوستان میں اس وقت روزی کمانے کا سوال سب سے زیادہ ضروری ہے۔ جامعہ ملیہ اس ضرورت کو محسوس کرتی ہے اور اپنے طلبہ میں یہ صلاحیت پیدا کرنا چاہتی ہے کہ ہر جائز طریقے سے روزی کما سکیں مگر اس کا اصول یہ ہے کہ انسان روزی کو زندگی کا، اجرت کو خدمت کا تابع سمجھے اور اپنا اصل مقصد یہ جانے کہ قومی تہذیب اور انسانی تہذیب کا مفید رکن بنے، یعنی سوسائٹی میں اپنے لیے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈھ لے جہاں وہ اپنی قوتوں سے پورا کام لے سکتا ہو اور مفید خدمت کر سکتا ہو اور اس کے ساتھ اتنا کما سکتا ہو کہ اُس کی اور اُس کے خاندان کی سب ضرورتیں پوری ہو جائیں۔"[۳۶]

یعنی جامعہ ملیہ ایک ایسا ادارہ ہے جو تعلیم کو زندگی خدمت و تہذیبی شعور سے جوڑنے والا جامع تعلیمی ماڈل پیش کرتا ہے۔ یہاں نصاب کی تفصیلی گنجائش نہیں مگر اس کے دیکھنے سے آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کے اہم اجزا تین ہیں مذہب کی تعلیم، فطرت کا مطالعہ اور انسانی زندگی کا مطالعہ۔

تعلیم کے جدید ترین طریقے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ نہ تو استاد علم کو زبردستی شاگردوں کے حلق میں ٹھونسے اور نہ گھول کر پلائے بلکہ ان کے دل میں علم کی سچی بھوک پیدا کر دے اور ان کے لیے غذا مہیا رکھے تاکہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنا پیٹ بھر سکیں۔ استاد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ طالب علم کو جاننے کا،

جانے ہوئے کو سمجھنے کا اور سمجھے ہوئے کو برتنے کا شوق ہو جائے۔

جامعہ میں اول سے آخر تک تعلیم کا ذریعہ سوائے انگریزی کے اور سب مضامین میں اردو زبان ہے۔ غیر زبان میں تعلیم دینا طلبہ کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس سے ان کی دماغی قوتوں کا اور ان کے وقت کا اتنا خون ہوتا ہے کہ کم سے کم دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے میں سب حامیان تعلیم اور محبان وطن کو جامعہ ملیہ کا ساتھ دینا چاہیے۔

عام تعلیم کے بعد جامعہ اپنے طلبہ کے لیے مفید پیشوں کی تربیت کا انتظام کرنا چاہتی ہے۔ ان لوگوں کو جنھوں نے صرف اسکول کی تعلیم پائی ہے: نجاری جلد سازی، ڈیری فارمنگ اور کیمیاوی صنعتوں یعنی صابن سازی وغیرہ سکھائی جائے گی اور کالج کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے تجارت اور اخبار نویسی کے مدرسے ہوں گے مگر جو خاص کام جامعہ اپنے سند یافتہ طالب علموں سے لینا چاہتی ہے یہ ہے کہ وہ معلمی کی تربیت حاصل کر کے تعلیمی مجاہدوں کی حیثیت سے ملک میں ابتدائی تعلیم کی اصلاح اور اشاعت کی کوشش کریں۔

علی گڑھ سے دہلی منتقلی کے بعد جامعہ کے نصب العین میں ایک بنیادی اور نمایاں تبدیلی رونما ہوئی، جس پر ہم پہلے ہی عابد حسین کے حوالے سے تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ اس نئے فکری و تعلیمی تصور کو مزید واضح کرنے کے لیے پروفیسر مجیب [۳۷] کے دو مضامین خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ پہلا مضمون ۱۹۵٦ء میں جامعہ کالج کی نئی عمارت کے افتتاح کے موقع پر بعنوان جامعہ کالج کی تاریخ اور اس کی اهمیت پیش کیا گیا، جب کہ دوسرا مقالہ دسمبر ۱۹٦۳ء میں ''جامعہ ۱۹٦۳ء میں'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان دونوں تحریروں کے تنقیدی مطالعے سے یہ امر ابھر کر سامنے آتا ہے کہ پروفیسر مجیب جامعہ ملیہ کے نصب العین اور اس کے تعلیمی و تہذیبی کردار کے بارے میں ایک ہمہ گیر اور اجتہادی تصور رکھتے تھے۔

مجیب صاحب نے مختلف ادوار میں متعدد علمی و فکری موضوعات پر خطابات اور لیکچرز پیش کیے۔ ذاکر صاحب کی غیر موجودگی کے دوران قائم مقام شیخ الجامعہ کے طور پر فرائض کی ادائیگی بھی ان کے ذمہ رہی۔ اس حیثیت میں پیش کیے گئے ان کے خطابات نہایت بامعنی اور فکر انگیز ہوتے تھے۔ استادوں کا مدرسہ کے افتتاحی اجلاس سے قائم مقام شیخ الجامعہ کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے انھوں

نے فرمایا:

> ''جامعہ والے ایک چھوٹی جماعت ہیں مگر اس جماعت کی ساری محنت اور سارا کام بیکار ہو جائے گا اگر وہ اپنی ملت میں فنا ہو کر اپنے نصب العین کو ہندوستان کے مسلمانوں کا نصب العین نہ بنا سکی اور کہیں ہم یہ نہ بھول جائیں کہ عمارت کام کے لیے بنتی ہے اور ہمیں اپنا کام اس طرح بڑھانا ہے کہ اس کے لیے کوئی عمارت کافی نہ ہو۔ جامعہ جب قائم ہوئی تو شاید کچھ لوگوں کو اس کی امید تھی کہ ہندوستان کو بہت جلد سوراج اور جامعہ کو اطمینان حاصل ہو جائے گا لیکن یہ غلط فہمی جلد دور ہو گئی اور حالات نے ہمیں یقین دلایا کہ جامعہ جب تک صبر و استقلال کا نمونہ نہیں بنے گی اسے کسی خدمت کے لائق نہ سمجھا جائے گا۔ اس لیے ہم نے طے کر لیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی دنیا کو آزمائیں گے، زندگی اور محنت کو ایک تجربہ پر صرف کریں گے۔''[۳۸]

اس متن میں مجیب صاحب اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہے کہ جامعہ کا وجود اور اس کی کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنی محنت اور نصب العین کو پوری ملت کی ضرورت بنا دے۔ عمارت مقصود نہیں بلکہ کام اصل مقصد ہے۔ جامعہ کے لیے جلد کامیابی کی توقع غلط ثابت ہوئی، اس لیے صبر استقلال اور مسلسل عملی جدوجہد کو اس کے راستے کا بنیادی اصول قرار دیا گیا۔

مجیب صاحب کی نظر میں جامعہ ملیہ ایک ایسا تعلیمی و قومی تجربہ ہے جو مختلف حوصلوں، ارادوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ وہ اس کو ایک بیج سے تشبیہ دیتے ہیں جو قوم کی زندگی کی زمین میں بویا گیا۔ اس زمین میں کچھ حصے پتھریلے اور کانٹوں سے بھرے تھے، یعنی مشکلات رکاوٹیں اور ناقدین موجود تھے، مگر کچھ حصے زرخیز بھی تھے، جہاں سے تعلیم و تربیت اور اصلاح قوم کے تندرست پودے رونما ہوئے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہے:

> ''حضرت عیسیٰؑ سے حکایت ہے کہ بونے والے نے بیج بکھیرے، جس میں سے کچھ پتھریلی زمین میں گرے اور انھیں چڑیوں نے چک لیا، کچھ

کانٹوں میں گرے اور جب وہ پھوٹے اور ان میں سے پودے نکلے تو کانٹوں نے انھیں پنپنے نہ دیا اور کچھ زرخیز زمین میں گرے جن سے تندرست پودے نکلے۔ تعلیمی حوصلو کے بیج قومی زندگی کی زمین پر بکھیرے جاتے ہیں تو ان کے ساتھ بھی یہی پیش آتا ہے۔ جامعہ کی ابتدا کسی ایک حوصلے سے نہیں ہوئی۔ یہ شروع ہی سے حوصلوں کا ایک مجموعہ تھی اور قومی زندگی کی بڑی زمین کے جس ٹکڑے میں اس کے بیج بکھیرے گئے اس میں بھی پتھر تھے اور کانٹے وزرخیز حصے بھی۔ اس وقت آپ جامعہ میں جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ انہی زرخیز حصوں کی پیداوار ہے۔''[۳۹]

جامعہ ملیہ قومی حوصلے قربانی اور مثبت فکری زمین کا ثمر ہے، جو تمام رکاوٹوں کے باوجود اپنے زرخیز نظریاتی حصے سے پھل پھول رہی ہے۔ جامعہ ایک ایسا تعلیمی ادارہ ہے جس کا مقصد سچی اور قومی تعلیم کا عملی نمونہ پیش کرنا ہے۔ جامعہ صرف تعلیم دینے کی جگہ نہیں بلکہ تعلیم کے صحیح تصور کو دریافت کرنے اور اسے قوم کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ہے۔ مجیب صاحب مزید لکھتے ہے:

''جامعہ ملیہ کا مقصد صحیح اور سچی قومی تعلیم کا نقشہ اور نمونہ پیش کرنا تھا۔ یہ ایسا مقصد نہیں ہے جو کسی وقت بھی پورا پورا نظروں کے سامنے آسکے۔ ہم در اصل وہ تعلیمی کام کرتے رہے ہیں جو مفید تھے اور جنھیں انجام دینا ہمارے بس میں تھا۔ ہماری خصوصیت شاید یہ تھی کہ ہم سمجھتے رہے کہ یہ طے کرنا ہمارا فرض ہے کہ کون سے تعلیمی کام مفید ہیں اور اسی وجہ سے ان کی ذمہ داری لینے میں ہم نے اپنی مشکلوں اور مجبوریوں کا خیال نہیں کیا۔ اب ہمیں نئے سرے سے اس پر غور کرنا چاہیے کہ صحیح اور سچی تعلیم کیا ہے اسے قومی رنگ کیسے دیا جا سکتا ہے اور جامعہ کس طرح کا نقشہ اور نمونہ پیش کرسکتی ہے۔''[۴۰]

حقیقی قومی تعلیمی ادارہ وہی ہے جو قوم کی تمام ضروریات اور مسائل کو پیش نظر رکھے۔ جامعہ کا مقصد تعصب کے خطرات سے طلبہ کو آگاہ کرنا اور ایسا ماحول پیدا کرنا ہے جہاں مذہبی، لسانی اور سماجی

تعصبات پنپ نہ سکیں۔ پروفیسر مجیب اس امر پر زور دیتے ہوئے کہتے ہے:

''قومی تعلیم گاہ کہلانے کے مستحق ہم تبھی ہوں گے جب قومی زندگی کا ہر پہلو اور ہر بڑی ضرورت ہماری نظر میں ہو، ہمارے ملک میں مذہبی تعصب اب تک موجود ہے، ایک سلگتی آگ کی طرح جس کے شعلے کسی وقت بھی بھڑک سکتے ہیں، زبان اور نسل کے پیدا کیے ہوئے تعصب موجود ہیں، ذات پات کا خیال اس طرح حاوی ہے کہ بعض ریاستوں میں وزارت نہیں بن سکتی جب تک کہ اس میں ہر ذات کے لوگوں کی کافی نمائندگی نہ ہو اور بہت سے حلقوں میں شہریوں کا نمائندہ وہی چنا جا سکتا ہے جس کی ذات کے لوگوں کی اس حلقے میں اکثریت ہو۔ استاد قومی زندگی کے ان عیبوں سے واقف ہیں مگر ان کی اصلاح کرنا استاد اور تعلیم کا منصب نہیں سمجھتے۔ ہم بھی کچھ زیادہ نہیں کر سکتے، لیکن تعلیم کے سلسلے میں اپنے طالب علموں کو مختلف طریقوں سے ان قومی خطروں کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں اور رفتہ رفتہ جامعہ میں ایسی فضا اور ایسی ذہنیت پیدا کر سکتے ہیں کہ تعصب کی بیماری پھیل نہ سکے۔''[۱۴]

اس نکتے کی مزید توضیح کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''آج کل ہر طرف رشتے ٹوٹتے نظر آتے ہیں اور استاد اور شاگرد کا رشتہ بھی کچھ ٹوٹ سا گیا ہے۔ دوسروں کا لحاظ کرنا، چاہے وہ اپنے ہوں یا غیر، برابر کے یا بزرگ سے اس طرح بات کرنا کہ دوسرے پر اچھا اثر پڑے، طبیعت کو قابو میں رکھنا چاہیے، کوئی غصہ دلانے والی بات کرے وغیرہ۔ یہ قائدے آج کل کی تربیت اور تعلیم میں شامل نہیں سمجھے جاتے، یونیورسٹیوں میں طالب علموں کا ہر موقع سے فائدہ اٹھا کر ہنگامے کرنا کوئی عجیب یا انوکھا واقعہ نہیں مانا جاتا۔ جامعہ ایک ایسے دور سے صحیح سلامت گزر چکی ہے جب حکومت اسے مشتبہ نظروں سے دیکھتی تھی، حکومت سے واسطہ

رکھنے والے مسلمان اس سے ڈرتے تھے، ہندو اسے مسلمانوں کا ادارہ سمجھ کر اس سے الگ رہتے تھے۔ پھر ایک دور آیا جب مسلمان اسے کانگریسی ادارہ سمجھتے تھے اور چند ممتاز لیڈروں کے سوا کانگریسی اس کے رویے سے مطمئن نہ تھے۔ اس دور میں جامعہ کو ہمت اور سچائی نے برقرار رکھا، لیکن اب اس نئے دور میں جو جمہوری کہلاتا ہے، صرف جامعہ ہی نہیں بلکہ ہر تعلیم گاہ کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ صرف غرض کا رشتہ صحیح اور قائم رکھنے کے قابل مانا جاتا ہے۔ ترقی کی غرض استاد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے اور جگہ نہیں بدلتی تو بھی استاد اور یونیورسٹی کا رشتہ غرض کا رشتہ ہوتا ہے۔ طالب علم داخلہ لیتا ہے تو ڈگری لینے کی غرض سے علم حاصل کرنے کے شوق میں نہیں اور جس بات کا امتحان اور ڈگری سے تعلق نہ ہو اس سے اسے کوئی خاص واسطہ نہیں ہوتا۔ تہذیب ان ہی غیر ضروری چیزوں میں سے سمجھی جاتی ہے، اس کے خریدار کم ہیں اور اندیشہ ہے کہ کم ہوتے جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ تعلیم کو تہذیب سے الگ کیا گیا تو وہ ایک کاروبار، ایک دھوکہ بن کر رہ جائے گی، لیکن تعلیم کو تہذیب سے وابستہ وہی استاد رکھ سکتے ہیں جو تہذیب کے لیے ہر قیمت ادا کرنے پر تیار ہوں، جو اپنی محنت کا طالب علم سے معاوضہ نہ مانگیں، جو ایسے طالب علموں سے بھی محبت اور شفقت برتیں جو ان کی عزت نہیں کرتے یا اگر کرتے ہیں تو اس طرح کہ اس کا احساس نہیں ہوتا۔ جامعہ کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ یہاں استاد اور شاگرد کا رشتہ اب تک قائم ہے۔ یہی نہیں، بلکہ جامعہ چھوڑنے کے بعد بھی یہ رشتہ قائم رہتا ہے اور رفتہ رفتہ جامعہ کی ایک تعلیمی امت بن رہی ہے۔ اس امت میں ہر طبقے ہر مذہب اور ہر پیشے کے لوگ ہیں۔''[۴۲]

مجیب صاحب ۱۹۵۶ء میں جامعہ کالج کی نئی عمارت کے افتتاح کے موقع پر کی گئی تقریر میں

کہتے ہیں:

''مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ہم نے اپنے کام کے لیے جو راہیں چنیں ان میں ہماری مرضی اور انتخاب کا اتنا دخل نہیں تھا کیونکہ وہ پالیسی جو اب تک اختیار کی گئی ہے اور جو نتائج اس کے نکلے ہیں اس کے پیش نظر اب یہ احساس ہوتا ہے کہ کالج پر پوری توجہ کرنا نہایت معقول اور نہایت ضروری بات ہے تو یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے۔ ایک ایسے طریقے کار کی وجہ سے جس میں سماجی ضرورتوں اور معقول تعلیم کے اصولوں سے مطابقت ہے، ہم دراصل انہی تصورات اور اسی نصب العین کی طرف لوٹ آئے ہیں جن کو سامنے رکھ کر جامعہ کے بانیوں نے جامعہ کی بنیاد رکھی تھی یعنی ایک ایسا ادارہ قائم کرنا جس کی جڑیں تو اپنی ہی زمین میں پیوست ہوں لیکن اس کی ذہنی پرداخت وتقویت اور روحانی غذا کا سامان پوری دنیائے انسانیت سے حاصل کیا جائے۔''[۴۳]

مجیب صاحب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جامعہ کی موجودہ تعلیمی پالیسی کوئی اتفاق نہیں بلکہ بانیان جامعہ کے اصل نصب العین کی طرف واپسی ہے یعنی ایک ایسا ادارہ قائم کرنا جو اپنی تہذیبی جڑوں سے وابستہ رہے، مگر فکری و روحانی رہنمائی پوری انسانیت سے حاصل کرے۔ وہ مزید کہتے ہیں:

''ایسا ادارہ کیسی شخصیت کے افراد پیدا کرے گا، اس کا تصور بھی اس کا اپنا ہی تصور ہوگا۔ ہم نے متفقہ طور پر تسلیم کیا تھا کہ ہمارا طالب علم، مسلمان ہو یا غیر مسلم اسے اپنے مذہب کی اقدار اور اپنی اخلاقی وثقافتی روایت کا نمائندہ ہونا چاہیے، اسے اپنی شائستگی، متانت غور وفکر کی صلاحیت اور اہلیت کے اعتبار سے مفید شہری ہونا چاہیے۔ یعنی وہ ایسی شخصیت کا نمونہ ہو جس میں انیسویں اور بیسویں صدی کی ہندو مسلم تہذیب کی خوبیاں موجود ہوں۔ یہی اس علاقے کی مشترک تہذیب تھی۔ اس تہذیب کو ان لوگوں نے

مسترد کر دیا جو اسے مشترک تہذیب نہیں مانتے اور ان لوگوں نے بھی جو یہ سمجھتے ہیں کہ جدید مغربی تہذیب اس تہذیب سے بہتر ہے۔ اسے مسترد کر دینے کی وجہ سے نمونے کی مہذب شخصیت کے تصورات میں انتشار پیدا ہو گیا ہے، جس سے خود تہذیب و ثقافت کو نقصان پہنچا ہے۔ ہم نے اس تہذیب سے منہ نہیں موڑا ہے اور مہذب شخصیت کے بارے میں ہم اپنے تصورات پر قائم ہیں۔ ہم ان پر قائم رہیں گے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ اس طرح مستقبل کی مشترک تہذیب و ثقافت کے نمونے پیدا ہونے میں مدد ملے گی۔''[۴۴]

تعلیم اور جماعتی کام پر تقریر کرتے ہوئے پروفیسر مجیب صاحب کہتے ہے:

''جامعہ ملیہ میں چند صفت موجود ہیں جن کے بغیر کوئی تعلیمی بستی اپنا منصب پورا نہیں کر سکتی، اسے ایسے لوگوں نے قائم کیا جو نئے کام کے شوق میں ایک دوسرے کے رفیق بنے، جنھوں نے جماعت سے اپنا تعلق قائم رکھا اور آزاد بھی رہے اور جنھیں اس کا یقین تھا کہ وہ اپنی کار پردازی کی بدولت ترقی کریں گے لیکن جامعہ کی بستی بھی بہت چھوٹی ہے اور اس کے افراد بھی آزمائش کی اس منزل سے نہیں گزرے ہیں جب زندگی کا نظام رفاقت اور شخصی تعلقات سے برتر ہو جاتا ہے اور سوا اس کے ہر شخص اپنے کام کو انتہائی پابندی محنت اور خوش اسلوبی سے انجام دے، تسکین کا اور کوئی ذریعہ نہیں رہتا۔ جامعہ والے اپنی بستی کے خادم ہیں تو مخدوم بھی ہیں اور یہ خدمت کا پہلا اور نسبتا آسان مقام ہے، وہ منزل اس کے بہت آگے ہے جہاں انسان خادم ہی ہوتا ہے، اس سے مطمئن ہوتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے، مگر کوئی نئی زندگی کے خاکے بنانا چاہے تو جامعہ کی فضا میں بہت موزوں معلوم ہوگی۔ یہاں کار پردازی کا معیار بہت بلند نہ صحیح مگر کام میں وہ انہماک ہے جس کے بغیر کار پردازی ممکن نہیں ہوتی۔ یہاں وہ ساری پابندیاں ہیں جو

ذاتی اغراض کو ظاہر ہونے سے روکتی ہیں، یعنی دولت پیدا کرنے کا امکان نہیں، اثر بڑھانے سے فائدہ نہیں، آرام کے لیے کوئی سامان نہیں۔ یہاں امتیاز صرف کام کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے۔ اختیار صرف نئی ذمہ داری قبول کر کے بڑھایا جاسکتا ہے۔ یہ صرف ایک بنیاد ہے اور اسی کو قائم کرنے میں بہت سی عمریں صرف ہوگئی ہیں۔''[۴۵]

مجیب صاحب مذکورہ متن میں جامعہ کی تعلیمی اور اخلاقی بنیادوں کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہاں خدمت، سادگی، اخلاص، محنت اور ذمہ داری بنیادی اقدار ہیں۔ جامعہ کا مقصد ایسی فضا قائم کرنا ہے جہاں افراد ذاتی مفاد سے بلند ہوکر قومی وسماجی خدمت کے جذبے سے تربیت پائیں۔ مجیب صاحب کے نزدیک جامعہ ملیہ ایک تعلیمی تحریک ہے جو صحیح، سچی اور قومی تعلیم کے بیج قومی زندگی کی زمین میں بو کر ایسے باکردار، مہذب اور وسیع النظری رکھنے والے انسان تیار کرتی ہے جو تعصب سے پاک، تہذیب و اخلاق کے امین اور ہندوستان کی مشترکہ ثقافت کے نمائندہ ہوں۔ یہ ادارہ تعلیم کو خدمت، تہذیب اور اعلیٰ قدروں سے وابستہ رکھتا ہے۔

خلاصہ

مذکورہ بالا بحث سے یہ حقیقت آشکار ہوجاتی ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کیا ہے، یہ محض ایک تعلیمی ادارہ کی حیثیت سے وجود میں نہیں آئی بلکہ ایک تہذیبی وفکری منصوبے کے طور پر جلوہ گر ہوئی جس کی بنیاد علم کی ہمہ گیر اقدار پر مبنی اور مقصدیت سے معمور تعبیر پر رکھی گئی تھی۔ اس نے مذہبی و دنیوی علوم کی مصنوعی تفریق کو رد کرتے ہوئے ایک ایسا تعلیمی نظریہ پیش کیا جس میں تعلیم محض ذہنی نشوونما کا ذریعہ نہیں رہتی بلکہ اخلاقی تطہیر، روحانی ارتقا اور شہری ذمہ داری کے احساس کو بھی مہمیز کرتی ہے۔ جامعہ کے تعلیمی تصور نے ایک مربوط نظام تعلیم کی اساس رکھی، جس میں نصاب قرآن پر مبنی معرفت اور عربی زبان کے استحکام سے پیوست تھا، اور ساتھ ہی مادری زبان میں تدریس عملی ہنرمندی اور سماج کے حقیقی مسائل سے براہ راست تعامل کو بھی غیر معمولی اہمیت دی گئی۔ اس کا تعلیمی عمل نہ محض نمائشی تھا اور نہ ہی صرف معاشی غرض کا تابع بلکہ اس کا مقصد ایسے مثالی مسلمان ہندی شہری کی تشکیل تھا جو عقل و وحی عبادت و خدمت اور حب

الوطنی وآفاقی انسانی اخوت میں ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ اس فکری منصوبے کا مرکزی محور آزادانہ فکر سیاسی و فرقہ وارانہ دباؤ سے بے نیازی اور اخلاص، تنقیدی شعور اور اخلاقی عمل پر استوار تعلیمی اخلاقیات تھا۔ یوں جامعہ کا تجربہ تاریخ میں اس بلند نظریے کے طور پر ثبت ہوتا ہے جو ایسے باشعور سماجی طور پر فعال اور روحانی طور پر بیدار افراد کی تشکیل چاہتا ہے، جو نہ صرف قومی تعمیر نو بلکہ انسانی بہبود کے عالمی عمل میں بھی موثر کردار ادا کر سکیں۔

حواشی

۱۔ تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون نے ملک میں آزادی کی تڑپ پیدا کر دی اور ہر فرد کے دل میں علی برادران کے لیے محبت جاگزیں ہوگئی۔ اس تحریک نے انگریزی اسکولوں کا کالجوں اور سرکاری نگرانی میں چلائے جانے والے تعلیمی اداروں کو چھوڑ دینا فرض قرار دے دیا چنانچہ تعلیمی محاذ پر ترک موالات کے لیے مولانا محمد علی نے علی گڑھ کے ایم اے او کالج سے پہل کی۔ اسی لیے مولانا محمد علی کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں سرفہرست ہے۔ دراصل انہی کے ایما پر گاندھی جی نے علی گڑھ جا کر ترک موالات کے سلسلے میں طلبہ کو مخاطب کرنے کا پروگرام بنایا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ظفر احمد نظامی، معمارانِ جامعہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۰۱۱ء صفحات ۱۰۱-۱۳۶

۲۔ آپ بیسویں صدی کے ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز کے ایک ممتاز اسکالر تھے۔ ۹/اپریل ۱۹۹۰ء کو، جب آپ یونیورسٹی آف کشمیر کے وائس چانسلر تھے، کشمیر میں عسکریت پسندوں (Militants) کے ہاتھوں اغوا کیے گئے اور شہید کر دیے گئے۔ سن ۲۰۲۰ء سے میں اُن کی زندگی، شخصیت اور اسلامی فکر میں خدمات پر جامع اور تحقیقی کام کر رہا ہوں۔ یہ کتاب عنقریب "Mushir-ul Haq: A Conciliator of Tradition and Modernity" (مشیر الحق: روایت اور جدیدیت کے درمیان ایک ہم آہنگ شخصیت) کے عنوان سے شائع ہونے والی ہے۔

۳۔ سید عابد حسین ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص:۸

۴۔ اس حقیقت کا ادراک اس مضمون میں پیش کردہ ان کے اقتباسات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ مزید مطالعے کے لیے ملاحظہ ہو عبدالغفار مدہولی، جامعہ کی کہانی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۴ء؛ ظفر احمد نظامی، معماران جامعہ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۲۰۱۱ء جامعہ ملیہ اسلامیہ، تحریک، تاریخ، روایت، مرتبین شمیم حنفی، شہاب الدین انصاری شمس الحق عثمانی مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۰۳ء جوہر، جامعہ جوبلی نمبر، جشنِ سیمیں جامعہ ملیہ اسلامیہ، مرتبہ محمد عرفان نوری، دہلی ۱۹۴۶ء نقوش جامعہ: جامعہ کی کہانی جامعہ والوں کی زبانی مؤلف غلام حیدر، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۰۰۴ء شکیل اختر

فاروقی، اہل شوق کی بستی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۱۰ء

۵۔ بانیان ومعماران جامعہ کی حیات اور شخصیات کا مختصر مگر جامع تعارف بھی اپنی جگہ پیش کیا گیا ہے۔

۶۔ ظفر احمد نظامی معماران جامعہ، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۱۱، ص: ۱۳

۷۔ ایضاً

۸۔ مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸-۱۹۳۱ء) کا نام ''محمد علی''، تخلص ''جوہر'' اور لقب ''رئیس الاحرار'' تھا۔ مولانا محمد علی جوہر ۱۸۷۸ء میں رامپور کے ایک علمی وتہذیبی ماحول میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عبدالعلی خان رامپور دربار سے وابستہ تھے۔ جب محمد علی محض دو برس کے تھے، والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، ابتدائی تعلیم وتربیت کا فریضہ والدہ ماجدہ نے نہایت محنت، محبت وبصیرت کے ساتھ انجام دیا۔ تعلیم کا آغاز رامپور سے ہوا، پھر بریلی میں اس کی تکمیل کی، بعدازاں علی گڑھ سے امتیازی حیثیت کے ساتھ فارغ التحصیل ہوئے۔ ان کی غیر معمولی تعلیمی کارکردگی سے متاثر ہوکر ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی نے انھیں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان کے معروف ادارے آکسفورڈ روانہ کیا، جہاں انھوں نے تاریخ اور قانون کے مضامین کا انتخاب کیا۔

سنہ ۱۸۹۹ء میں وطن واپسی کے بعد آپ نے ریاست رامپور اور بڑودہ میں مختلف انتظامی خدمات انجام دیں لیکن جلد ہی کلکتہ کا رُخ کیا، وہاں سے ہفت روزہ ''کامریڈ'' (Comrade) کے نام سے ایک انگریزی اخبار جاری کیا۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو زبان پر بھی انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ عوام الناس تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے آپ نے ایک روزنامہ ''ہمدرد'' (Hamdard) بھی جاری کیا۔ ۱۹۱۴ء میں برطانوی پالیسی کے خلاف لکھنے پر آپ کو نظر بند کیا گیا۔ مولانا نے برطانوی حکومت کے خلاف بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور تحریک آزادی ہند میں فعال شرکت کے باعث اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ قید وبند کی صعوبتوں میں گزارا مگر وطن سے محبت اور آزادی کے جذبے میں کوئی کمی نہ آئی۔

۱۹۱۹ء میں رہائی کے بعد آپ نے تحریک خلافت کا آغاز کیا، جس میں برصغیر کے مسلمانوں نے آپ کا بھرپور ساتھ دیا۔ بعد ازاں آپ نے مہاتما گاندھی کی تحریک عدم تعاون (Non-co-operations movement) میں بھی حصہ لیا۔ اسی تحریک کے زیر اثر مولانا نے گاندھی جی کے اشتراک سے جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی، جو آج ایک Central University کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ آپ کانگریس کے سرگرم رکن رہے اور تحریک عدم تعاون کے سبب کئی برس قید میں بھی رہے۔ رہائی کے بعد ۱۹۲۳ء میں آپ کو کانگریس پارٹی کا صدر منتخب کیا گیا، آپ نے ہندو مسلم اتحاد (Hindu-Muslim unity) کے فروغ کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دیں، بعض ہندوؤں کی ذہنیت کی وجہ سے مولانا کانگریس سے الگ ہو گئے۔

مولانا جوہر نہ صرف ایک مایہ ناز مصنف اور سیاسی رہنما تھے بلکہ نثر ونظم دونوں میں اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ شعرو

ادب سے ان کی دل چسپی بچپن ہی سے نمایاں تھی اور رامپور کا ادبی ماحول ان کی فطری صلاحیتوں کے لیے مہمیز ثابت ہوا۔ شاعری میں داغ کے شاگرد تھے۔ اُس دور میں داغ دہلوی، امیر، تسلیم اور جلال جیسے شعرا کا شہرہ عروج پر تھا۔ داغ دہلوی مولانا کی ذہانت اور شگفتگی طبع سے اس قدر متاثر تھے کہ اگر وہ ملاقات کے لیے نہ آتے تو انھیں بلوا بھیجتے۔ زندگی کے آخری ایام میں مولانا کا میلان عشق حقیقی کی طرف بڑھا، مگر عملی مصروفیات نے اس جانب زیادہ وقت دینے کی اجازت نہ دی۔

ملک کی سیاسی وقومی زبوں حالی نے آپ کو بے حد مضطرب کیا، چنانچہ آپ گول میز کانفرنس (The Round Table Conference) میں شرکت کے لیے انگلستان تشریف لے گئے، علیل ہونے کے باوجود وہاں آپ نے ایک ولولہ انگیز اور تاریخی تقریر کی۔ مولانا کا انتقال لندن میں قیام کے دوران ۴رجنوری ۱۹۳۱ء کو ہوا، اور آپ کو بیت المقدس میں سپرد خاک کیا گیا۔ مزید مطالعہ کے لیے ملاخطہ ہو حیات جوہر، مرتبہ مولانا عشرت رحمانی رامپوری ۱۹۳۱ مولانا محمد علی جوہر، مؤلف حسن اعرانی پنجاب بک ڈپو (لاہور) جامعہ، اپریل ۱۹۷۹ء، جلد ۷۶، شمارہ: ۳ خطبہ صدارت مولانا محمد علی مطبوعہ جامعہ ملیہ علی گڑھ، ۱۹۲۳ء تقاریر مولانا محمد علی صدیق بک ڈپو، لکھنو آج کل، جلد: ۳۷ شمارہ: ۵، دسمبر ۱۹۷۸ء حیاتِ جوہر، ۱۹۳۱ء حیاتِ مولانا محمد علی جوہر، مؤلف، ضیاء الدین احمد برنی اردو اکیڈمی سندھ ۲۰۰۱ء جوہر نامہ مرتب حکیم محمد عرفان الحسینی کلکتہ، ۱۹۸۷ء مقالات محمد علی، رئیس احمد جعفری ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد دکن ۱۹۴۳ء؛ مولانا محمد علی شخصیت اور خدمات مرتبہ سید نظر، برنی ۱۹۷۶ء مولانا محمد علی کی یاد میں، سید صباح الدین عبدالرحمان دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ جامعہ مولانا محمد علی نمبر مدیر، ضیاء الحسن فاروقی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۹۸۰ء؛ نیا دور، مولانا محمد علی جوہر نمبر جلد، ۵۹، ۶۰ نمبر ۱۱، ۱۲ فروری مارچ اپریل ۲۰۰۵ء لکھنؤ مولانا محمد علی جوہر، نمبر نگار پاکستان نومبر دسمبر ۱۹۷۸ء، شمارہ: ۱۱؛ معماران جامعہ، ظفر احمد نظامی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۰۱۱ء؛ جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک تاریخ روایت مرتبین شمیم حنفی، شہاب الدین انصاری، شمس الحق عثمانی مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۰۳ء جوہر جامعہ جوبلی نمبر جشن سیمیں جامعہ ملیہ اسلامیہ، مرتبہ، محمد عرفان نوری دہلی ۱۹۴۶ء نقوش جامعہ جامعہ کی کہانی جامعہ والوں کی زبانی مؤلف غلام حیدر مرتبہ جامعہ نئی دہلی: ۲۰۰۴ء؛ اہلِ شوق کی بستی شکیل اختر فاروقی مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۰۱۰ء جامعہ کی کہانی عبدالغفار مدہولی مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۴ء)

۹۔ آپ کا پہلا مضمون بعنوان جامعہ ملیہ کا مقصد کیا ہے جو ہمدرد میں ۳۰ را کتوبر ۱۹۲۵ء کو شائع ہوا تھا۔ ''ہمدرد'' کے ۸رجنوری ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں مولانا محمد علی کا دوسرا مضمون بعنوان جامعہ ملیہ اسلامیہ کیا ہے شائع ہوا۔ جامعہ پر اپنے تیسرے مضمون بعنوان جامعہ ملیہ اسلامیہ کی چند اور خصوصیات مادری زبان میں تعلیم میں جو ''ہمدرد'' کے ۹رجنوری ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ مولانا کا چوتھا مضمون ہ ''مدرد'' کے ۱۶رجنوری ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا ''جامعہ ملیہ اسلامیہ: مسلمانوں کی اقتصادی حالت کی اصلاح'' اپنا پانچواں اور آخری مضمون

مولانا نے جامعہ کی ایک اور خصوصیت خدا پرستی ملت پروری وطن دوستی کے عنوان سے 'ہمدرد' کے ۱۸رجنوری ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں شائع کیا تھا۔

۱۰۔ مولانا محمد علی جوہر، جامعہ ملیہ کا مقصد کیا ہے؟ 'ہمدرد' ۳۰ را کتوبر ۱۹۲۵ء

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ مولانا محمد علی جوہر، جامعہ کی ایک اور خصوصیت خدا پرستی ملت، پروری وطن دوستی، ہمدرد، ۳۰ را کتوبر ۱۹۲۵ء

۱۳۔ مسلمانوں کی سیاست کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا محمد علی نے فرمایا کہ مذہب میرے خیال کے مطابق حیات انسانی کی تشریح کا نام ہے۔ میرے پاس ایک تمدن ہے، ایک ضابطہ اخلاق ہے۔ زندگی کا ایک نظریہ ہے اور حیات اجتماعی کے لیے ایک مکمل نظام ہے جس کو اسلام کہتے ہیں۔ خدائے برتر کے حکم کے سامنے میں اول مسلمان ہوں دوئم مسلمان ہوں اور آخر بھی مسلمان اور سوائے مسلمان کے کچھ نہیں۔ لیکن جن امور کا ہندستان سے تعلق ہے، ہندوستان کی آزادی سے تعلق ہے، ہندستان کی فلاح و بہبود سے تعلق ہے، میں اول ہندستانی ہوں دوئم ہندوستانی ہوں اور آخر میں ہندستانی ہوں اور ہندستانی کے سوا کچھ نہیں۔ میں ان مساوی الجسامت دائروں سے تعلق رکھتا ہوں جن کے دو مختلف مرکز میں ایک ہندستان اور دوسرا دنیائے اسلام۔

۱۴۔ ایک مسلمان کے لیے آزاد ہونا لازمی ہے اس لیے وہ سوائے خدا کے کسی کا عبد و غلام نہیں ہوسکتا۔

۱۵۔ مولانا محمد علی جوہر، '' جامعہ کی ایک اور خصوصیت خدا پرستی ملت، پروری وطن دوستی'' ہمدرد ۳۰ را کتوبر ۱۹۲۵ء

۱۶۔ دیکھیے پہلا اور دوسرا مضمون '' جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے کیا؟ ''، مولانا محمد علی جوہر، ہمدرد، ۱۹۲۵، نئی دہلی

۱۷۔ دیکھیے: جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے کیا؟ مولانا محمد علی جوہر، ہمدرد، ۱۹۲۵ء، نئی دہلی

۱۸۔ مزید مطالعے کے لیے دیکھیے: Z.A. Ni??m?, Hakim Ajmal Khan, Publications Division, New Delhi, 1988

۱۹۔ دیکھئے: جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے کیا؟ مولانا محمد علی جوہر، ہمدرد، ۱۹۲۵، نئی دہلی

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ: مسلمانوں کی اقتصادی حالت کی اصلاح، مولانا محمد علی جوہر، ہمدرد، ۱۶رجنوری ۱۹۲۸ء، نئی دہلی

۲۲۔ جامعہ ملیہ کا مقصد کیا ہے؟ مولانا محمد علی جوہر، ہمدرد، ۳۰ را کتوبر ۱۹۲۵ء، نئی دہلی

۲۳۔ ڈاکٹر سید عابد حسین (۱۹۷۸-۱۸۹۶ء) کا شمار بیسویں صدی کے اہم اور ممتاز دانشوروں، ادیبوں اور رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ عابد حسین صاحب اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا مجھے اردو سے محبت صرف اس لیے نہیں ہے کہ یہ میری مادری زبان ہے بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ میری محبوب ہندوستانی تہذیب کی زبان ہے۔ انھوں نے عربی اور فارسی بھی پڑھی تھی، جرمن زبان میں بھی ان کی

مہارت اہل زبان عالموں کی سی تھی۔ایک جانب انھوں نے انگریزی اور جرمن زبان سے کثرت سے تراجم کیے، دوسری جانب اردو میں اپنے فکری اور تخلیقی کارناموں کے ذریعے ایک مستقل اور گہرا اثر چھوڑا۔ان کا محبوب موضوع فلسفہ، ادب ہندوستانی تہذیب وثقافت کی تاریخ اور قومی زندگی میں مسلمانوں کا کردار تھا۔ان کے تاریخی اور ادبی نقطۂ نظر پر گاندھی کے افکار (Gandhian influences) کی گہری چھاپ نمایاں نظر آتی ہے۔

میں عابد صاحب کا آبائی وطن ضلع قنوج میں ایک گاؤں دائی پور ہے، کہا جاتا ہے کہ ان کے جد امجد سید حسن بندگی ترمذ سے ہندوستان آئے تھے، انھوں نے دائی پور میں اپنی خانقاہ بنائی اور وہیں بس گئے۔ عابد صاحب ۲۵/جولائی ۱۸۹۶ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے جہاں ان کے دادا اور والد سید حامد حسین ریاست بھوپال کی ملازمت کے سلسلے میں رہتے تھے۔ عابد حسین نے اپنی ابتدائی واعلیٰ تعلیم الہ آباد اور علی گڑھ کی جامعات سے حاصل کی۔ابتدائی تعلیم کچھ زیادہ منظم نہیں رہی، چند برس بھوپال کے جہانگیریہ اسکول پڑھا،۱۹۱۲ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے اول درجے سے ہائی اسکول پاس کیا۔انٹر سائنس کے مضامین کے ساتھ پاس کیا۔سائنس کی طرف طبیعت مائل نہیں تھی، بی اے میں فلسفہ انگریزی اور فارسی مضامین لیے اور سن ۱۹۲۰ء پوری الہ آباد یونیورسٹی میں اول آئے۔فلسفے میں ایم اے کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ریاست بھوپال سے وظیفہ تو مل رہا تھا لیکن ملک میں اس وقت سیاسی افراتفری کا دور تھا، عدم تعاون تحریک زوروں پر تھی اس لیے پڑھائی نہیں ہو پا رہی تھی۔الہ آباد یونیورسٹی کا بھی وہی حال تھا۔لہٰذا انھوں نے لندن جا کر پڑھنے کی ٹھانی۔لیکن گھر کے مالی حالات اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، بھوپال میں نواب حمید اللہ خاں سے لندن جا کر پڑھنے کے لیے مالی مدد مانگی جو نہیں مل سکی لیکن عابد صاحب ہار ماننے والے نہیں تھے، لندن گئے قرض لے کر کام چلایا اور پھر مالی مشکلات کے پیش نظر جرمنی میں داخلہ لیا جہاں تعلیم اور رہنا سستا تھا، ان کے والد نے بھوپال سے وظیفہ بھی بحال کرا دیا۔ برلن یونیورسٹی سے ڈی فل (D.Phil) کی ڈگری حاصل کی۔ برلن میں ان کی ملاقات ذاکر حسین اور محمد مجیب سے ہوئی، اور تینوں نے مل کر حکیم اجمل خان سے رابطہ قائم کیا، جو اُس وقت برصغیر کے ممتاز قومی رہنما اور گاندھی جی کے نہایت قریبی رفیق تھے۔انہی روابط کے نتیجے میں وہ مثلث وجود میں آئی جس نے بعد ازاں ہندوستان میں جامعہ ملیہ کی فکری اور ادارہ جاتی تشکیل میں مرکزی کردار ادا کیا۔

آکسفورڈ اور جرمنی میں قیام نے عابد حسین کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ ہندوستانی زندگی کو مغربی ترقی اور تہذیبی حرکیات کے تناظر میں دیکھ سکیں، آزادی ہند کی جدوجہد کو وسیع تر تمدنی سیاق میں سمجھ سکیں۔اسی عرصے میں وہ گاندھی جی کے افکار سے گہرے طور پر متاثر ہوئے، یہ اثر اس حد تک راسخ ہوا کہ اُن کی ساری زندگی قومی خدمت اور فکری خود انحصاری کے عزم کے تابع ہو گئی۔

وطن واپسی پر وہ ۱۹۲۶ء میں جامعہ ملیہ سے وابستہ ہوئے، جہاں انھوں نے فلسفہ و اردو ادب کے پروفیسر کی

حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ چند سال جامعہ کے پرنسپل رہے اور جامعہ کے خازن (ٹریزار) بھی رہے۔ رسالہ ''جامعہ'' کے مدیر اور بچوں کے رسالے ''پیام تعلیم'' کے بانی اور مدیر تھے۔ بچوں کے لیے اس میں لکھتے بھی تھے۔ ان کو جامعہ کے وائس چانسلر کے عہدے کی پیشکش ہوئی جس کو انھوں نے اپنی علمی کاموں کے پیشِ نظر قبول نہیں کیا، چند سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں گذارے اور جنرل ایجوکیشن کا شعبہ قائم کیا۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی جامعہ کی خدمت کے لیے وقف کردی حالانکہ اُن کی تنخواہ بہ مشکل گزر بسر کے لائق تھی۔

سید عابد صاحب نے سب سے زیادہ کام ترجمے کے میدان میں کیا، وہ اردو کے چوٹی کے مترجم مانے جاتے ہیں۔ ان کے ابتدائی تراجم میں گوئٹے (Goethe) کا Faust، جی بی شا (G.B. Shaw) کا St. Joan، مکالمات افلاطون (Selected Dialogues of Plato)، کانٹ کی کریٹیک آف پیورریزن (Critique of Pure Reason)، اور ڈی بور (T.J. De Boer) کی تاریخ فلسفہ اسلام (History of Philosophy in Islam) شامل ہیں۔ بعد ازاں انھوں نے گاندھی کی M.K. Gandhi-My Experiments with Truth کا 'تلاشِ حق: مہاتما گاندھی کی آپ بیتی' کے عنوان سے نہرو کی تصانیف Jawaharlal Nehru: An Autobiography کا ''میری کہانی: جواہر لال نہرو'' اور Discovery of India کا ''تلاشِ ہند کے عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا، جو نہ صرف بے حد مقبول ہوا بلکہ انھیں اردو کے ممتاز نثر نگاروں کی صفِ اول میں لاکھڑا کیا۔ انھوں نے اپنی علمی توانائی کا ایک بڑا حصہ مولوی عبدالحق کی اردو اسٹینڈرڈ ڈکشنری (Standard English-Urdu Dictionary) کی تدوین میں صرف کیا جو دراصل نئے سرے سے لکھنا ہی تھا، اگر چہ انھیں اس کا وہ اعتراف نہیں ملا جس کے وہ حق دار تھے۔

عابد صاحب کی شخصیت میں لطافت حس مزاح (a lively sense of humour) بھی پائی جاتی تھی، وہ محدود مگر منتخب حلقہ احباب میں خوش گفتاری کے لیے معروف تھے۔ تاہم عمومی طور پر ان کی زندگی گوشہ نشینی، علم دوستی اور قلمی ریاضت میں گزری وہ اپنی نثر میں لفظ کے صحیح محل اور مفہوم کی نزاکت پر غیر معمولی توجہ دیتے، ان کا طرز بیان بامعنی سادگی، براہ راست اظہار اور فکری صفائی کا مرقع تھا۔

آپ کی شادی خواجہ غلام السیدین کی بہن، مولانا حالی کی پرنواسی مصداق فاطمہ سے ہوئی جو صالحہ عابد حسین کے نام سے مشہور ہیں اور ناول نگاری اور تحقیق میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ ان کی پہلی شادی زمانہ طالب علمی میں ہی اپنی عم زاد بہن سے ہوگئی تھی جو چل نہیں سکی۔ دونوں شادیوں سے ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ عابد صاحب نے اپنی بر تصنیف پر برسوں محنت کی اور کم مگر نہایت معیاری علمی وفکری کتابیں قوم کے سپرد کیں۔ ۱۹۴۶ء میں ان کا شہرہ آفاق کام ''ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب کا مسلہ' (The Problem of Indian Nationalism and National Culture) ہے، جو تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ آزادی کے بعد اس

کا مختصر ایڈیشن (abridged edition) ۱۹۵۶ء میں ''قومی تہذیب کا مسئلہ'' کے نام سے شائع کیا اور انگریزی میں "The National Culture of India" کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ جسے ساہتیہ اکادمی کا اعلیٰ ترین انعام (The National Academy of Letters) دیا گیا۔ ۱۹۵۷ء میں حکومت ہند نے انھیں ان کی علمی وقومی خدمات کے اعتراف میں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا اور دہلی سرکار کا سرسوتی سمان ملا۔ ان کی ایک اور اہم تصنیف ''ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں'' ہے، جس کا انگریزی ترجمہ "The Destiny of Indian Muslims" کے عنوان سے شائع ہوا۔

وہ کئی برس تک دی آفیشل لینگویج کمیشن (The Official Language Commission) اور نیشنل کمیشن فار کوآپریشن ود یونیسکو (National Commission for Co-operation with UNESCO) کے رکن رہے۔ انھوں نے جون ۱۹۴۸ء میں ہفت روزہ اخبار ''نئی روشنی'' نکالا جو کئی سالوں تک جاری رہا۔ اس میں وہ ایک مزاحیہ کالم خود بھی لکھتے تھے جو بہت مشہور ہوا۔ آپ اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی کے بانی اور مدیر تھے، دو سال بعد اس کے تحت ''اسلام اور عصر جدید'' (۱۹۶۹ء، اردو) اور Islam and the Modern Age (۱۹۷۰ء، انگریزی) کے عنوان سے رسائل شائع کیے گئے، جو آج بھی جاری ہیں۔ آپ سات برس تک آل انڈیا ریڈیو میں اردو کے ساہتیہ صلاح کار کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ لینگویج کمیشن میں اردو کے ماہر اور نمائندے کے طور پر بھی شامل تھے۔

عابد حسین ۲۰ رمئی ۱۹۷۸ء کو انتقال کر گئے۔ عابد صاحب نے ایک درویشانہ انکسار اور سچی لگن کے ساتھ علم وفن کی خدمت کی اور اپنے عہد کی علمی اور فکری روایت کو آگے بڑھایا۔ عابد حسین کی نثر الفاظ کی معیشت، جذبات کے ضبط، غیر جانب دار فکری توازن اور سادہ مگر گہرے اسلوب کی ایسی مثال ہے جو ہر دور کے لیے ایک نمونہ عمل اور معیار کمال کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اپنی وفات تک علمی، ادبی اور فکری سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ ان کی وفات سے ہندوستان نے ایک ایسے دانشور مفکر اور مصلح کو کھو دیا جو قومی ہم آہنگی، تہذیبی مکالمے اور جدید تعلیم کے علمبردار تھے۔ ان کی علمی وادبی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ مزید مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو سید عابد حسین ہندستانی ادب کے معمار، قاضی عبید الرحمان ہاشمی، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی ۱۹۹۵ء؛ ڈاکٹر سید عابد حسین یادگاری خطبات، مرتبہ، نثار احمد فاروقی ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ، نئی دہلی ۱۹۸۵ء معاصر شخصیات، مشیر الحق، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۰۶ ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب، سید عابد حسین مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۶۵ء؛ حیات عابد، مرتبہ صغریٰ مہدی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۸۴ء مضامین عابد، کتابی دنیا لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۴۷ء؛ مسلمان اور عصری مسائل، سید عابد حسین مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۷۲ء قومی تہذیب کا مسئلہ، سید عابد حسین انجمن ترقی اردو علی گڑھ، ۱۹۵۵ء ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں، عابد حسین، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۵ء سید عابد حسین تہذیبی و سیاسی

بصیرتیں (نئی روشنی کے حوالے سے)، مرتبین اختر الواسع فرحت احساس مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۰۱۲ء؛ معماران جامعہ ظفر احمد نظامی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۰۱۱ء جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک، تاریخ، روایت، مرتبین شمیم حنفی شہاب الدین انصاری شمس الحق عثمانی مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء جوہر، جامعہ جوبلی نمبر جشن سیمیں جامعہ ملیہ اسلامیہ مرتبہ محمد عرفان نوری دہلی ۱۹۴۶ء نقوش جامعہ، جامعہ کی کہانی جامعہ والوں کی زبانی، مؤلف غلام حیدر، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۰۴ء؛ اہل شوق کی بستی شکیل اختر فاروقی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۲۰۱۰ء جامعہ کی کہانی، عبدالغفار مدہولی مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۴ء اسلام اور بدلتی دنیا، ضیاء الحسن فاروقی، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء

S.A. Husain, The Destiny of Indian Muslims, Asia Publishing House, New Delhi, 1965; S.A. Husain, The National Culture of India, National Book Trust, New Delhi, 1987.)

۲۴۔ جامعہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۶ء تک سید عابد حسین، جامعہ دسمبر ۱۹۶۳ء

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ ایضاً

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ، سید عابد حسین، جامعہ، دسمبر ۱۹۲۸ء صفحات ۱تا۱۹

۲۹۔ ایضاً، صفحات ۲۹ تا ۳۷

۳۰۔ ایضاً، صفحات ۳۸ تا ۴۵

۳۱۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ، سید عابد حسین، جامعہ، دسمبر ۱۹۲۸ء صفحات ۴۶ تا ۵۰ (آپ مضمون کے آخر میں اس بات کی وضاحت بھی کرتے ہے کہ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں مسلمانوں کے لیے ایک تعلیمی نصب العین کا خاکہ پیش کیا ہے۔ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ یہ خاکہ نامکمل ہے اور اس میں اصلاح کی بہت گنجائش ہے۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اپنی قوم کے ارباب فکر میں تعلیمی مسائل کو وسیع تمدنی نظر سے دیکھنے کی تحریک پیدا کریں۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ جامعہ ملیہ کے ارباب حل وعقد ہماری معروضات پر غور فرمائیں اور ہماری تعلیم گاہ کے لیے جو عملاً صحیح راستے پر جارہی ہے، ایک مکمل وسیع اور ترقی پذیر نظام ترتیب دیں تا کہ قوم کے بہترین دماغوں کو اس پر غور کرنے کا موقع ملے۔)

۳۲۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۹۶۹-۱۸۹۷ء) جمہوریہ ہند کے سابق صدر، ایک ہمہ جہت، متین اور شائستہ شخصیت کے مالک تھے۔ ایسی ہستی جو اپنے اندر پرانیب تہذیب کی شرافت، متانت اور وقار کا حسین امتزاج رکھتے تھے۔ فطرتاً وہ ایک انسان دوست اور عقلیت پسند مفکر تھے۔ ان کی تصانیف میں Capitalism: An Essay in

"National System of کی (Fredrich List) فریڈرک لسٹ ،Understanding
?? "Elements of کی (Edwin Cannan) اور ایڈون کینن ،(اردو ترجمہ) "Economics
"Economics" (اردو ترجمہ) ان کی معاشی اور علمی تربیت کی مظہر ہیں۔ تاہم، ان کی دیگر تصانیف مثلاً ''حالی: محبِ وطن''، ''تعلیمی خطبات'' اور افلاطون کی مشہور تصنیف ''جمہوریہ''(The Republic) کا اردو ترجمہ، اردو ادب کے قیمتی ذخیرے میں درجہ زرّیں رکھتی ہیں۔

ذاکر حسین کے آباواجداد فریدی پٹھان تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا آبائی وطن قائم گنج ضلع فرخ آباد ہے، کیونکہ آپ کے آباء و اجداد چند صدیوں قبل افغانستان سے ہجرت کر کے اتر پردیش کے ضلع فرخ آباد میں آکر آباد ہوئے۔ خود ڈاکٹر صاحب کی ولادت حیدر آباد دکن میں ہوئی جہاں ان کے والد ایک کامیاب بیرسٹر تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ایک انگریز ٹیوٹر کے ذریعے ہوئی۔ ذاکر صاحب کو اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں بھیج دیا گیا جہاں سے انھوں نے ہائی اسکول کیا۔ بعدازاں وہ علی گڑھ کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں جب وہ تعلیم عالیہ کے آخری مرحلے میں تھے، تحریک عدم تعاون اپنے عروج پر تھی۔ اُس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی برطانوی سرپرستی کے زیر اثر تھی، اس کا بنیادی مقصد ایسے مسلم نوجوان تیار کرنا تھا جو برطانوی حکومت کی ملازمت کے لیے کارآمد ثابت ہوں۔

اسی دوران مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے مسلم رہنماؤں نے طلبہ میں قومی بیداری پیدا کی۔ ان کی دعوت عمل سے متاثر ہو کر ایک خود مختار قومی تعلیمی ادارے کے قیام کا فیصلہ ہوا، جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نام دیا گیا۔ میں یہاں یہ واضح کر دوں کہ جامعہ کا ابتدائی نام "National Muslim University" تھا۔ بعدازاں اس کا عربی ترجمہ جامعہ ملیہ اسلامیہ رائج ہوا اور آج اسے اسی نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ذاکر حسین ان اولین افراد میں سے تھے جنھوں نے علی گڑھ کو خیر باد کہہ کر جامعہ کے قافلے میں شمولیت اختیار کی۔ آپ نے دو برس تک جامعہ میں تدریسی خدمات انجام دیں، پھر ۱۹۲۳ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جرمنی روانہ ہوئے، جہاں برلن یونیورسٹی سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ (Ph.D) کی سند حاصل کی۔ جرمنی میں قیام کے دوران اپنی رفیق کار مس فلپس بورن جو بعد میں ان کے ساتھ جامعہ میں بھی شریک کار رہیں) کے زیر اثر فنون لطیفہ، موسیقی، مصوری ڈرامہ اور فن تعمیر کا ذوق پیدا ہوا۔ جرمنی میں ان کے ساتھ عابد حسین اور محمد مجیب بھی تھے۔ ان تینوں نے ۱۹۲۶ء میں ہندوستان واپس آکر بہت کم تنخواہوں پر جامعہ کی بقا کے لیے خود کو وقف کر دیا اور جامعہ کے ''ارکان ثلاثہ'' کہلائے۔ ہندوستان واپسی پر اگرچہ آپ گاندھی جی کے افکار و نظریات سے متاثر ہو چکے تھے، تاہم آپ نے سیاست کے بجائے تعلیم کے میدان کو اپنی خدمت کا مرکز بنانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں آپ نے جامعہ ملیہ کی سربراہی سنبھالی اور ۱۹۴۸ء تک اس کے وائس چانسلر کے منصب پر فائز رہے۔ اسی عرصے میں وہ سیواگرام میں گاندھی جی کے تعلیمی منصوبے ہندوستانی تعلیمی سنگھ پلان کے سرگرم رفیق کار بنے اور قومی تعلیمی نظام کی تشکیل میں نمایاں کردار

ادا کیا۔ ۱۹۳۷ء میں جب گاندھی جی نے بنیادی تعلیم (Basic Education) کا نظریہ پیش کیا تو اس کی ترویج وتشریح میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا کردار نہایت اہم رہا۔

تعلیم کے میدان میں ذاکر صاحب کی خدمات بہت اہم ہیں۔ گاندھی جی کے تجویز کردہ بنیادی تعلیم کے منصوبے کو انھوں نے تراش خراش کر ایک منظم اور قابل عمل نصاب کی شکل دی۔ جامعہ میں ان کی قیادت میں ہونہار اور محنتی استادوں کی ٹیم نے ابتدائی تعلیم اور استادوں کے مدرسے سے تعلیم کے میدان میں ایسے تجربے کئے جو اس دور کے سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھے۔ اس دور کے طریقۂ تعلیم کی تفصیلات جامعہ سے متعلق کئی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کے زیر قیادت جامعہ میں درسی کتابوں اور بچوں کے ادب پر بہت کام ہوا۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں، مشہور لکھنے والوں کو بچوں کے لیے لکھنے پر آمادہ کیا۔ مکتبہ جامعہ قائم ہوا جس نے بچوں کے لیے بہت کم قیمت پر بہت دلچسپ کتابیں شائع کیں۔ بچوں کا رسالہ ''پیام تعلیم'' جاری ہوا جس کے بانی عابد حسین تھے۔ اس رسالے کے لیے خود ذاکر صاحب نے ۱۷ کہانیاں اپنی مرحومہ بیٹی ریحانہ رقیہ کے نام سے لکھیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی کہانیاں ہیں جو انھوں نے اپنے نام سے لکھیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے ڈرامے بھی لکھے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد آپ نے مختلف اعلیٰ مناصب پر خدمات انجام دیں: ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۷ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ۱۹۵۷ء میں راجیہ سبھا کے رکن پھر ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۲ء ریاست بہار کے گورنر اور ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۷ء ملک کے نائب صدر جمہوریہ رہے۔ اسی عرصے میں آپ کی معروف تصانیف "The Dynamic University" اور "Educational Reconstruction in India" منظر عام پر آئیں۔ قوم کے لیے غیر معمولی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے آپ کو ۱۹۶۳ء میں ملک کے اعلیٰ ترین اعزاز ''بھارت رتن'' سے نوازا۔ مئی ۱۹۶۷ء میں وہ صدر جمہوریہ ہند منتخب ہوئے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین گاندھی جی کے مخلص پیروکار تھے، اور ان کی نثر میں گاندھی کے افکار (Gandhian Thoughts) کی جھلک نمایاں ہے۔ ان کی اردو تحریریں ہندوستانی کے قریب ہیں، جو اردو اور ہندی دونوں کی مشترکہ اساس ہے۔ ان کے اسلوب نثر کی خصوصیت الفاظ کی جامعیت اور دلکشی ہے۔ ہر لفظ پورے مفہوم کی ادائیگی کرتا ہے، مگر اس میں شخصی گرمی زبان کی چاشنی اور محاورے کی تازگی بھی برقرار رہتی ہے۔ یہی وصف ہے جو ذاکر صاحب کو اردو نثر کے ایک مقبول مصنف کے طور پر ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ مزید مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر ذاکر حسین ایک سوانح، محمد مجیب نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی، ۱۹۷۶ء؛ ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت وشخصیت مرتبہ عبداللطیف اعظمی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۶۷ء؛ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل کمیٹی حیدرآباد، ۱۹۷۲ء؛ ڈاکٹر ذاکر حسین خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۹ء؛ ڈاکٹر ذاکر حسین ایس ایچ بھارتی پارس پبلیکیشنز حیدرآباد؛ ڈاکٹر ذاکر حسین شخصیت اور کارنامے مرتبہ گوپی چند نارنگ اردو اکادمی، دہلی ۱۹۶۷ء؛ ڈاکٹر

ذاکرحسین حیات فکر اور عمل مرتبین عبدالغفار شکیل، ڈاکٹر خلیق انجم اردو اکادمی، بنگلور،۱۹۹۹ء؛ نذر ذاکر، مجلس نذر ذاکر، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۶۸ء ذاکر صاحب کی کہانی سعیدہ خورشید عالم مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۷۵ء؛ معماران جامعہ ظفر احمد نظامی مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۲۰۱۱ء جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک، تاریخ، روایت، مرتبین شمیم حنفی، شہاب الدین انصاری، شمس الحق عثمانی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۰۳ء جوہر جامعہ جوبلی نمبر جشن سیمیں جامعہ ملیہ اسلامیہ مرتبہ محمد عرفان نوری دہلی ۱۹۴۶ء نقوش جامعہ: جامعہ کی کہانی جامعہ والوں کی زبانی مؤلف غلام حیدر مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۰۴ء؛ اہل شوق کی بستی، شکیل اختر فاروقی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۰۱۰ء جامعہ کی کہانی، عبدالغفار مدہولی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۶۴ء ذاکر صاحب اپنے آئینۂ لفظ و معنی میں، مرتب ضیاء الحسن فاروقی، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء

Z.H. Faruqi, Dr. Zakir Hussain: Quest for Truth, A.P.H. Publishing Corporation, New Delhi, 1999; M. Mujeeb, Dr. Zakir Husain: A Biography, National Book Trust, Delhi, 1972;V.S. Mathur, ed., Zakir Husain: Educationist and Teacher, Arya Book Dept, New Delhi, 1969; Salamatullah & A.W.B. Qadri, Zakir Husain on Education, National Council for Teacher Education, Delhi, 1999.

۳۳۔ دیکھیے کتابچہ ''جامعہ ملیہ کیا ہے؟از: ذاکر حسین، ۱۹۴۵ء

۳۴۔ ایضاً

۳۵۔ ایضاً

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ پروفیسر محمد مجیب (۱۹۸۵-۱۹۰۲ء) ایک ممتاز دانشور، مؤرخ و ماہر تعلیم تھے۔ جنھیں اعلیٰ ترین تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ محمد مجیب نے علمی و تعلیمی خدمات کے ذریعے قومی تحریک کی خدمت کی اور ۱۹۲۶ء سے جامعہ ملیہ سے وابستہ رہے، جہاں انھوں نے تاریخ کے استاد کے طور پر اور بعد ازاں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۳ء تک شیخ الجامعہ کے منصب پر خدمات انجام دیں۔ محمد مجیب متعدد زبانوں پر عبور رکھتے تھے، جن میں اردو انگریزی، روسی، جرمن اور فرانسیسی شامل ہیں۔ ان کی شہرہ آفاق تصنیف ہندوستانی مسلمان اور انگریزی میں "The Indian Muslims" ان کے فکری و تحقیقی کارناموں کا مظہر ہے۔ انھوں نے اردو و انگریزی دونوں زبانوں میں متعدد کتابیں، ڈرامے اور مضامین تحریر کیے۔ پروفیسر مجیب نے علمی و ثقافتی سطح پر عالمی نمائندگی بھی کی۔ وہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی (UN General Assembly) اور یونیسکو (UNESCO) کے اجلاسوں میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ وہ ترقی اردو بورڈ ہندوستانی تعلیمی سنگھ اور ساہتیہ اکادمی جیسے ممتاز اداروں

کے رکن بھی رہے۔ حکومت ہند نے ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۶۵ء میں انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا۔ پروفیسر مجیب کی شخصیت جدید ہندوستانی فکر تعلیم اور تہذیبی ہم آہنگی کی ایک درخشاں علامت کے طور پر ہمیشہ یاد کیے جاتے ہے۔

محمد مجیب ۳۰/اکتوبر ۱۹۰۲ء کو لکھنؤ اتر پردیش کے ایک معزز اور اشرافیہ زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کے افراد سیاست تجارت قانون اور فنون لطیفہ جیسے مختلف شعبوں سے وابستہ رہے اور ہر ایک نے اپنے اپنے میدان میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ محمد مجیب نے ابتدائی وروایتی تعلیم گھر پر حاصل کی جہاں سب سے پہلے انھیں عربی کی تعلیم دی گئی اور اس کے بعد قرآن مجید سے روشناس کرایا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں محمد مجیب کی شادی بیگم آصفہ سے ہوئی جو سندیلا کے ایک معزز خانوادے سے تعلق رکھتی اور بردوئی کے ممتاز اور خوش حال وکیل مقبول حسن کی صاحبزادی تھیں۔ تقریباً چار یا پانچ برس کی عمر میں محمد مجیب کو لکھنؤ کے لوریتو کونوٹ اسکول (Loretto Convent School) میں داخل کیا گیا۔ یہ ان کی ابتدائی رسمی تعلیم کا آغاز تھا۔ جب وہ بارہ برس کے قریب تھے تو انھوں نے لوریتو کونوٹ کو خیر باد کہا اور ایک مسلم اسکول میں داخلہ لیا، جہاں ایک سال تک تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں وہ کیمبرج پریپریٹری اسکول (Cambridge Preparatory School) دہرادون میں داخل ہوئے، جہاں انھیں یونیورسٹی آف کیمبرج کے نصاب کے مطابق تعلیم دی گئی۔ ۱۹۱۹ء میں سترہ برس کی عمر میں وہ نیو کالج آکسفورڈ (New College, Oxford) گئے جہاں انھوں نے تاریخ کے مضمون کا انتخاب کیا۔ انگلستان میں قیام کے دوران ان کی زبانوں سے دلچسپی میں مزید اضافہ ہوا، اور انھوں نے فرانسیسی زبان سیکھی۔ رفتہ رفتہ انھیں احساس ہوا کہ ان کا رجحان تاریخ سے زیادہ ادب کی طرف ہے اس لیے انھوں نے روسی ادب میں گہری دلچسپی لینا شروع کیا۔

۱۹۲۲ء میں آپ نے نیو کالج آکسفورڈ سے تاریخ میں گریجویشن مکمل کیا۔ انھیں مشورہ دیا گیا کہ وہ طباعت پرنٹنگ) کی تعلیم جرمنی سے حاصل کریں۔ آکسفورڈ ہی میں ان کی ملاقات عابد حسین سے ہوئی جو ان دنوں تحقیق میں مصروف تھے۔ عابد صاحب کی اردودانی اور اردو میں گفتگو کا سلیقہ محمد مجیب پر گہرا اثر ڈال گیا۔ ان دنوں عابد صاحب مالی مشکلات سے دوچار تھے اور انھوں نے بھی جرمنی جانے کا فیصلہ کیا۔ برلن میں محمد مجیب اور عابد حسین ہیر شوانر (Herr Schwaner) کے مکان میں بطور پینگ گیسٹ مقیم ہوئے۔ چند مان بعد، ستمبر ۱۹۲۲ء میں ذاکر حسین بھی جرمنی پہنچے اور وہ بھی انہی کے ساتھ اسی مکان میں قیام پذیر ہوئے۔ تقریباً ایک سال برلن میں قیام کے بعد محمد مجیب لائپزگ (Leipzig) منتقل ہوئے جہاں انھوں نے طباعت کی اعلیٰ وفنی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک وہ چار سال جرمنی میں مقیم رہے، اس دوران انھوں نے فنون لطیفہ میں مہارت پیدا کی طباعت کی عملی تربیت حاصل کی اور جرمن فرانسیسی وروسی زبانوں میں اپنی لسانی صلاحیتوں کو مزید نکھارا۔

محمد مجیب ذاکر حسین اور عابد حسین فروری ۱۹۲۶ء میں جامعہ ملیہ سے وابستہ ہوئے۔ جامعہ کی برادری نے اس مثلث علم وعمل کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ان کی آمد جامعہ کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ثابت ہوئی، جس کے بعد ادارے میں فکری تعلیمی اور انتظامی سطح پر اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ محمد مجیب کو تاریخ کے شعبے میں پروفیسر مقرر کیا گیا، جہاں وہ ہندوستان اور انگلستان کی تاریخ اردو زبان میں پڑھاتے تھے۔ ان کے طلبہ انگریزی اصطلاحات کے اردو مترادفات فراہم کرنے میں ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ انگریزی زبان پر ان کا عبور کامل تھا، تاہم اردو زبان پر قدرت حاصل کرنا ان کے لیے ایک چیلنج تھا وہ سوچا کرتے تھے کہ اردو دانی کو بہتر بنانے کا مؤثر ذریعہ کیا ہوسکتا ہے۔ اسی جستجو کے نتیجے میں انھوں نے اردو میں لکھنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ ایک منفرد اور رواں اسلوب نگارش اختیار کیا۔ اس زمانے میں جامعہ کے مجلّے ''جامعہ'' میں لکھنا علمی سرگرمی کا لازمی جزو سمجھا جاتا تھا، چنانچہ مجیب صاحب نے بھی اس میں لکھنا شروع کیا۔

۱۹۲۸ء میں انھیں جامعہ پریس دریا گنج دہلی کا انچارج مقرر کیا گیا۔اس پریس کے قیام میں ان کے والد محمد نسیم کی مالی معاونت شامل تھی تاہم مالی اور فنی مشکلات کے باعث یہ پریس صرف دو برس ہی چل سکا۔ مجیب صاحب چاہتے تھے کہ پریس کا معیار یورپی مطابع کے ہم پلہ ہو، مگر اس وقت کے ہندوستانی حالات میں یہ توقع پوری نہ ہوسکی۔ مزید یہ کہ انھیں طباعت کے کام سے ذہنی مناسبت بھی محسوس نہ ہوئی، چنانچہ پریس کو بالآخر بند کرنا پڑا۔

جامعہ کے ابتدائی اساتذہ کو سخت مالی تنگی اور قربانی کے دور سے گزرنا پڑا۔ چونکہ جامعہ نے تحریک عدم تعاون کے اصولوں کے مطابق حکومتی امداد سے انکار کر رکھا تھا، اس لیے ادارہ صرف قومی حمایت اور عوامی تعاون پر انحصار کرتا تھا۔ محمد مجیب نے بھی اسی روح کے تحت جامعہ میں صرف پچھتر (۷۵) روپے ماہانہ تنخواہ پر خدمات انجام دینے کا فیصلہ کیا، جو اس زمانے میں ایک بڑی قربانی کے مترادف تھا۔ ۱۹۲۸ء میں ذاکر حسین نے ''انجمن تعلیمی ملی'' کی بنیاد رکھی جس کے اراکین بشمول محمد مجیب اور شفیع الرحمٰن نے ایک تحریری عہد نامے پر دستخط کیے کہ وہ آئندہ بیس سال تک جامعہ کی خدمت ایک سو پچاس روپے سے زیادہ تنخواہ کے بغیر انجام دیں گے۔

محمد مجیب کا جامعہ سے وابستہ ہونے کا فیصلہ ان کے اہلِ خانہ اور احباب کی خواہش کے خلاف تھا۔ بعض قریبی عزیزوں نے انھیں کم تنخواہ کے باعث اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش بھی کی، مگر محمد مجیب کے نزدیک مادی مفاد کبھی فیصلہ کن نہیں رہا۔ انھوں نے بعد میں اپنی کتاب "Speaking for Myself" میں خود سے یہ فلسفیانہ سوال کیا کہ کیا میں مطلوب ہوں یا غیر مطلوب (whether am I wanted or not wanted) اور اسی کے جواب میں وہ اعتراف کرتے ہیں کہ جامعہ میں کام کرنے کے تجربے نے انھیں یہ احساس دلایا کہ انسان اپنی زندگی کو مکمل طور پر جی سکتا ہے، خواہ دنیا کے معیار کے مطابق وہ غیر مطلوب ہی کیوں نہ قرار دیا جائے۔

محمد مجیب ذاکر حسین کے معاون خاص کے طور پر جامعہ کے روزمرہ امور میں سرگرم رہے۔ ۱۹۴۵ء میں حکومت ہند

کی ایک کمیٹی نے جامعہ کی ڈگری کو باقاعدہ تسلیم کیا۔ اگلے ہی برس ۱۹۴۶ء میں جامعہ نے جشن سیمیں (Silver Jubilee Celebration) منایا۔ ۱۹۴۷ء میں ذاکر حسین کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے طور پر تقرری کے بعد محمد مجیب کو جامعہ کا قائم مقام وائس چانسلر (Pro-Vice Chancellor) مقرر کیا گیا، اور ۸/ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو وہ باضابطہ طور پر شیخ الجامعہ کے منصب پر فائز ہوئے۔ محمد مجیب نے ۱۹۷۳ء تک یعنی پچیس برس تک مسلسل جامعہ کے وائس چانسلر کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے، جو آج تک جامعہ کی تاریخ میں سب سے طویل مدت ہے۔ ان کے عہدِ قیادت میں جامعہ ملیہ نے نہ صرف تعلیمی، تہذیبی و تعمیراتی ترقی (infrastructural development) کی، بلکہ نئے علمی و فنی کورسز کے (academic and technical courses) اجرا کے ذریعے ایک جامع، جدید اور خود مختار تعلیمی ادارے کی حیثیت حاصل کی۔ محمد مجیب نے قومی تعمیر و ترقی کے مختلف شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور متعدد علمی و تہذیبی اداروں کی بنیاد رکھی اور ان کی قیادت کی۔ اُنھی کی کوششوں سے حکومت ہند نے ''ترقی اردو بورڈ'' قائم کیا، جو بعد ازاں ۱۹۹۶ء میں نیشنل کونسل فار پروموشن آف اردو لینگویج (National Council for Promotion of Urdu Language) کے نام سے معروف ہوا۔ محمد مجیب طویل عرصے تک اس ادارے کے صدر کے عہدے پر فائز رہے۔ مرکزی مذہبی تعلیمی بورڈ کے (The Central Religious Educational Board) قیام کے بعد ۱۹۵۵ء میں آپ اس کے مشترک سکریٹری (Joint Secretary) مقرر کیے گئے۔ دسمبر ۱۹۵۶ء میں دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''آج کل'' کے ادارتی بورڈ کے رکن نامزد ہوئے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے اوائل میں حکومت ہند نے مسلم پرسنل لاء کے تجدیدی و اصلاحی پہلوؤں پر غور و خوض کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے اراکین میں حافظ محمد ابراہیم، ہمایوں کبیر، بیگم انیس قدوائی اور دیگر ممتاز شخصیات شامل تھیں۔ اس کمیٹی میں مجیب صاحب بھی رکن تھے۔ ۱۹۶۲ء میں حکومت ہند نے آپ کو نیشنل انٹیگریشن کمیٹی (National Integration Committee) کا رکن نامزد کیا، اور انھوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو کی دعوت پر نیشنل انٹیگریشن کونسل (National Integration Council) کی رکنیت بھی قبول کی۔ نہرو نے تعلیم کے ایک ہمہ گیر و مربوط نقطہ نظر کی تشکیل کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین اور محمد مجیب کو پلاننگ کمیشن (National Integration Council) کے ساتھ وابستہ کیا۔ محمد مجیب ہندوستانی تعلیمی سنگھ (Indian Educational Board) اور ساہتیہ اکادمی کے بھی رکن رہے۔ آپ نے علمی و ثقافتی سطح پر متعدد ممالک کے سفر کیے اور قومی و بین الاقوامی اداروں میں لیکچرز دیے۔ آپ نے چین، روس، یوگوسلاویہ، لائبیریا، ترکی، برطانیہ اور امریکہ جیسے ممالک میں مختلف علمی و سفارتی وفود کے رکن کی حیثیت سے شرکت کی ۱۹۴۹ء میں آپ نے حکومت ہند کی نمائندگی کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی (United Nations General Assembly)

میں شرکت کی اور ۱۹۵۱ء میں ہند ''وچین دوستی کمیٹی'' (Indo-China Friendship Committee) کے وفد کے ساتھ چین کا دورہ کیا۔ ۱۹۵۲ء میں جنیوا و پیرس گئے، ۱۹۵۴ء میں یونیسکو (UNESCO) کے اجلاس میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ ۲۰ر ستمبر ۱۹۵۴ء کو آپ نے یوگوسلاویہ کا دورہ کیا۔ ۱۹۵۶ء میں حکومت ہند نے آپ کو روس کے نظامِ تعلیم کے مطالعے کے لیے تشکیل دیے گئے وفد کا رکن نامزد کیا۔ ۲۷ر جولائی ۱۹۶۱ء کو آپ نے ''ورلڈ کنفیڈریشن آف آرگنائزیشن آف دی ٹیچنگ پروفیشن'' (World Confederation of Organisation of the Teaching Profession) کے دسویں سالانہ اجلاس میں استقبالیہ خطاب پیش کیا۔ یہ اجلاس ۲۷ر جولائی سے ۷ر اگست تک نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ ستمبر ۱۹۶۱ء میں آپ نے کینیڈا کی میک گل یونیورسٹی (McGill University, Montreal) میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں اور ۱۹۶۲ء میں جامعہ ملیہ واپس آئے۔ اسی برس آپ نے جرمنی میں مختلف مذاہب کے علما پر مشتمل ایک بین المذاہب کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ ۲۰ر فروری ۱۹۶۵ء کو آپ نے شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ کے چودھویں جلسہ تقسیم اسناد میں خطبہ استقبالیہ دیا۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں مجیب صاحب امریکہ گئے جہاں آپ نے مختلف امریکی جامعات میں مرزا غالب پر سلسلہ وار لیکچرز دیے۔ یہ تمام خدمات اس بات کا مظہر ہیں کہ مجیب صاحب نے نہ صرف تعلیم وتہذیب کے میدان میں اپنی فکر وبصیرت سے ہندوستان کو نئی جہتیں عطا کیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ملک کی علمی وثقافتی شناخت کو وقار بخشا۔

محمد مجیب ۲۰ر جنوری ۱۹۸۵ء کو دہلی میں وفات پاگئے اور جامعہ ملیہ کے قبرستان میں سپردخاک کیے گئے۔ اُن کے انتقال پر اُس وقت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی نے اپنے تعزیتی پیغام میں گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ''مجھے یہ جان کر بے حد افسوس ہوا کہ پروفیسر مجیب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ وہ ایک سچے قوم پرست، پیدائشی معلم اور نہایت وسیع مطالعہ و وقار رکھنے والے مؤرخ تھے... جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ہمارا ملک اس عظیم شخصیت سے محروم ہوگیا جو ہماری تہذیب وثقافت کی بہترین نمائندگی کرتی تھی۔''

یہ کلمات اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ مجیب صاحب نہ صرف جامعہ ملیہ کے وقار کے امین تھے بلکہ ہندوستانی تہذیب کی روحانی وفکری میراث کے ایک معتبر ترجمان بھی تھے۔ مزید مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو ''محمد مجیب حیات اور اردو خدمات'' صادقہ ذکی، ڈاکٹر صادقہ ذکی، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء ہندوستانی مسلمان محمد مجیب قومی کونسل برائے اردو زبان نئی دہلی ۱۹۶۶ء ہندوستانی سماج پر اسلامی اثر اور دوسرے مضامین، محمد مجیب قومی کونسل برائے اردو زبان نئی دہلی ۲۰۱۱ء مجیب صاحب احوال وافکار مرتبین ضیاء الحسن فاروقی، مشیر الحق، شہاب الدین انصاری، عبداللطیف اعظمی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۸۴ء معماران جامعہ، ظفر احمد نظامی مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۱۱ء ''جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک تاریخ روایت'' مرتبین شمیم حنفی، شہاب الدین انصاری، شمس الحق عثمانی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۰۳ء؛ جوہر

جامعہ جوبلی نمبر، جشنِ سمیں جامعہ ملیہ اسلامیہ، مرتبہ: محمد عرفان نوری دہلی ۱۹۴۶ء؛ ''نقوش جامعہ: جامعہ کی کہانی جامعہ والوں کی زبانی'' مؤلف غلام حیدر، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۰۰۴ء؛ ''اہلِ شوق کی بستی''، شکیل اختر فاروقی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۰۱۰ء؛ ''جامعہ کی کہانی'' عبدالغفار مدھولی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۴ء جامعہ مجیب صاحب کی یاد میں، مجیب نمبر مدیر ضیاء الحسن فاروقی نئی دہلی، ۱۹۸۶ء

M.F. Hussain, Mohammad Mujeeb, Sahitya Akademi, New Delhi, 2016; M. Mujeeb, The Indian Muslims, London, George Allen & Unwin, 1967; M. Mujeeb, Islamic Influence on Indian Society, Meenakshi Prakashan, Meerut, 1972.

۳۸۔ معمارانِ جامعہ، ظفر احمد نظامی مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۰۱۱ء، ص: ۲۸۰

۳۹۔ جامعہ ۱۹۶۳ء میں، محمد مجیب، جامعہ دسمبر ۱۹۶۳ء

۴۰۔ جامعہ ۱۹۶۳ء میں، محمد مجیب، جامعہ دسمبر ۱۹۶۳ء (مجیب صاحب ان تینوں سوالوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں ان سوالوں کے جواب دے سکتا ہوں۔ میں بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جامعہ کا اصل مقصد صرف اس صورت سے پورا ہوسکتا ہے کہ ہم جو کچھ سوچیں اور کریں اس میں ہمارا محرک یہ احساس ہو کہ ہمیں ان تین بنیادی سوالوں کا جواب دینا ہے، ورنہ تعلیم کا مطلب نصاب کے مطابق پڑھنا او قاعدے کے مطابق امتحان لینا ہوگا، اور یہ ایسا طریقہ ہے جس میں تعلیم کے صحیح اور سچے ہونے کا سوال نہیں اٹھتا، صرف امتحان کے نتیجے دیکھے جاتے ہیں، قوم کا ذکر دو چار مرتبہ تقریروں میں کر دیا جاتا ہے اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ تعلیمی ادارہ جیسا بھی ہو اسے ایک نمونہ کہا جاسکتا ہے۔''

۴۱۔ جامعہ ۱۹۶۳ء میں، محمد مجیب، جامعہ دسمبر ۱۹۶۳ء

۴۲۔ ایضاً

۴۳۔ جامعہ کالج کی تاریخ اور اس کی اہمیت محمد مجیب، ۱۹۵۶ء

۴۴ ایضاً

۴۵۔ تعلیم اور جماعتی کام محمد مجیب جوبلی نمبر ۱۹۴۶ء

اسلام اور عصرِ جدید (سہ ماہی)

کے خاص شمارے

سیرت ومغازی کی اولین کتابیں اور ان کے مؤلفین..............۲۰۰روپے
اسلامی تہذیب وتمدن (دورِ جاہلیت سے آغاز اسلام تک)..............۳۰۰روپے
معلمِ عصر: سعید نورسیؒ..............۲۰۰روپے
پیکر دین ودانش: امام غزالیؒ..............۳۰۰روپے
قرآن مجید، مستشرقین اور انگریزی تراجم..............۱۰۰روپے
مولانا عبیداللہ سندھی..............۲۰۰روپے
مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت..............۱۵۰روپے
افکارِ ذاکر..............۱۵۰روپے
ڈاکٹر سید عابد حسین اور نئی روشنی..............۲۵۰روپے
بیاد پروفیسر مشیر الحق..............۲۰۰روپے
نذرِ رومی..............۲۰۰روپے
نذرِ علی محمد خسرو..............۱۰۰روپے
بیاد خواجہ غلام السیّدین..............۱۰۰روپے

نوٹ: ان کے علاوہ پچھلے عام شمارے بھی ۱۰۰؍روپے کی شرح سے دستیاب ہیں۔ اسٹاک محدود ہے۔ پانچ شماروں پر ۱۵فیصد تجارتی کمیشن بھی دیا جائے گا۔ محصول رجسٹرڈ ڈاک خریدار کے ذمے ہوگا۔

رابطے کا پتا: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

رسالہ

جامعہ

کے خاص شمارے

میر تقی میر (جلد اول و دوم)	۶۰۰روپے
محمد علی اور پروانۂ آزادی	۳۰۰روپے
گاندھی اور گاندھیائی فکر	۳۰۰روپے
جشن زریں نمبر	۱۰۰روپے
ڈاکٹر مختار احمد انصاری	۱۰۰روپے
سالنامہ ۱۹۶۱ء	۱۰۰روپے
اسلم جیراجپوری نمبر	۱۰۰روپے
پروفیسر محمد مجیب نمبر	۱۰۰روپے
مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں	۱۵۰روپے
پریم چند کی یاد میں	۱۰۰روپے
نہرو نمبر	۱۰۰روپے
جامعہ پلاٹینم جوبلی نمبر	۱۰۰روپے
ابوالکلام آزاد نمبر (پہلی اور دوسری جلد)	۳۰۰روپے
خواجہ حسن نظامی اور اُردو نثر	۱۰۰روپے
خلیل الرحمن اعظمی کی یاد میں	۱۰۰روپے
بلونت سنگھ کی یاد میں	۱۰۰روپے
ابوالفضل صدیقی کی یاد میں	۱۵۰روپے
نذرِ انیس	۳۰۰روپے

نوٹ: ان کے علاوہ پچھلے عام شمارے بھی (۱۹۶۱ء تا حال) فی ۱۰۰روپے کی شرح سے دستیاب ہیں۔ اسٹاک محدود ہے۔ پانچ شماروں پر ۱۵فیصد تجارتی کمیشن بھی دیا جائے گا۔ محصول رجسٹرڈ ڈاک خریدار کے ذمے ہوگا۔

رابطے کا پتا: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

Vol. LVII | No. 04 | RNI No. 17614/69 | October 2025

'اسلام اور عصر جدید' کے خصوصی شمارے



ISLAM AUR ASR-I-JADEED

Peer Reviewed
ISSN 2278-2109
Zakir Husain Institute of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia, New Delhi110025
Phone:011-26841202